# آجکل

فروری 2019

₹22/-

اردو کا بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

# آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر

حسن ضیاء

فون:011-24369189

ڈاکٹر ابرار رحمانی

جلد:77 شمارہ:07

فروری2019 پوش۔ماگھ شک1940

کمپوزنگ : آئی احمد

سرورق : علی اطہر

جوائنٹ ڈائریکٹر (پروڈکشن): وی کے مینا

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ:22روپے سالانہ:230روپے

دوسال: 430روپے تین سال:610روپے

امریکہ،یورپ اور دوسرے ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک سالانہ730روپے

پڑوسی ممالک کے لیے بذریعہ ہوائی ڈاک: سالانہ530روپے

خریداری واشتہار کے لیے منی آرڈر، ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر

DG, Publications Division کے نام اس پتہ پر بھیجیں:

بزنس منیجر

جرنلس یونٹ، پبلی کیشنز ڈویژن، روم نمبر56، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی110003

فون نمبر: 011-24365609

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایتیں بزنس منیجر

کو مندرجہ ذیل آئی ڈی پر میل کریں

pdjucir@gmail.com

مضامین/تخلیقات سے متعلق رابطے کا پتہ:

ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، A-601، سوچنا بھون

سی جی او کمپلیکس، نئی دہلی۔110003

Website: www.publications division.nic.in

E-mail: ajkalurdu@gmail.com

# ترتیب

**اداریہ** : غالب کا تازہ کلام — حسن ضیاء — 4

## گوشۂ غالب:

مجنوں گورکھپوری اور غالبؔ — ڈاکٹر جمال اویسی — 5

مرزا غالب اور دبستانِ میرٹھ — ابراہیم افسر — 8

مزارِ غالب کی بازیافت — شاہد ماہلی — 16

غالب کی ترقی پسندی — ٹی آر رینا — 18

## مقالات

فیض: صوفی ازم سے مارکسزم تک — سید محمد نیر رضوی — 23

گاندھی جی اور ہندوستانی زبان — ڈاکٹر سید حسنین اختر — 27

## یاد رفتگاں

پروفیسر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کا انفراد — ڈاکٹر اشرف آثاری — 29

ادب کا چنار — عبدالصمد — 32

## منظومات

پروفیسر مظفر حنفی، ایم قمرالدین، شفیق احمد — 33

مناظر حسن شاہین، بدنام نظر، ڈاکٹر مقصود احمد انصاری — 34

عمران عظیم، شاہد اختر، ثناء اللہ ثنا دوگھروی — 35

## افسانے:

خالی فریم — پروفیسر غضنفر — 36

شیطان کی موت — گلزار جاوید — 39

اے زندگی — تبسم زہرا — 41

## ڈراما:

اس شکل سے گزری غالب — پروفیسر صادق — 44

## تبصرے: — مبصر — 47

جہات سرسید/ڈاکٹر شمس بدایونی — ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب

مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری/ ڈاکٹر گل رعنا — صدر عالم گوہر

حریفِ تیرگی/ ڈاکٹر لاڈلے رہبر — تابش مہدی

بوجھ سکھی ری بوجھ/فراغ روہوی — صدر عالم گوہر

بولتے الفاظ/ابوالخیر نشتر — ابوظہیر ربانی

## مراسلات: — 51

**حرف آخر:** اردو ایک سیکولر زبان — ڈاکٹر ابرار رحمانی — 54

# غالب کا تازہ کلام

**اس** بار 27 دسمبر کو غالب کے یوم پیدائش پر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انگریزی اور ہندی حلقوں اور میڈیا میں بھی غالب سے دلچسپی کے احیاء کے اشارے مل رہے ہیں۔ 1969 میں غالب صدی کے موقعہ پر ملک بھر میں ہوئے پروگراموں کے ساتھ ساتھ اس وقت کے انگریزی میڈیا نے بھی غالب پر توجہ دے کر انگریزی کے قارئین کو بھی غالبؔ کے حلقے میں لانے میں مدد دی تھی، لیکن وہ الگ دور تھا۔ اس وقت انگریزی میڈیا سے جڑے قلمکار اور صحافی اردو زبان وادب یا کلام غالب سے جس سطح کی واقفیت رکھتے تھے وہ چیز آج ممکن نہیں ہے۔ فراق گورکھپوری، علی جواد زیدی، جگن ناتھ آزاد جیسے ادیب، لالہ مہیشور دیال، اندر جیت لال جیسے قلم کار یو گندر پال اور آر۔ وی اسمتھ جیسے انگریزی صحافی (اور ان جیسے متعدد نام) اگر انگریزی میڈیا میں اردو زبان وادب کو موضوع بناتے تھے تو ان کے حوالے غیر معتبر ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ ماضی قریب کے اردو داں انگریزی صحافیوں کے سبب اردو، انگریزی میڈیا میں بھی جگہ پاتی تھی۔ آج الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے۔ ماضی کے چند اخبارات اور رسائل تک محدود میڈیا کی دنیا اب یکسر بدل چکی ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ماضی میں اردو شعر وادب پر دسترس رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔

غالب کے یوم پیدائش کے موقعہ پر الیکٹرانک میڈیا کے مشہور چینلوں نے غالب پر اس برس خصوصی توجہ دی لیکن غالب کے جو 'اشعار' اس بار سننے کو ملے وہ حسب ذیل ہیں:

کچھ اس طرح میں نے زندگی کو آسان کرلیا
کسی سے مانگ لی معافی، کسی کو معاف کردیا

غالب شراب پینے دے مسجد میں بیٹھ کر
یا پھر وہ جگہ بتا جہاں پر خدا نہیں

ہاتھوں کی لکیروں پہ مت جا اے غالب
نصیب ان کے بھی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ نہیں ہوتے

ہم تو فنا ہوگئے ان کی آنکھیں دیکھ کر
نہ جانے وہ آئینہ کس طرح دیکھتے ہوں گے

ہم نے محبت کے نشے میں آکر اس کو خدا بناڈالا
ہوش تب آیا جب اس نے کہا خدا کسی ایک کا نہیں ہوتا
مجھے کہتی ہے تیرے ساتھ رہوں گی سدا
غالب بہت پیار کرتی ہے مجھ سے میری اُداسی

ایک زمانہ تھا کہ غالب کا متداول دیوان، نسخہ حمیدہ، نسخہ عرشی موضوع بحث ہوا کرتے تھے اور اکثر بحث در بحث کا سلسلہ رکنے کا نام نہیں لیتا تھا لیکن آج سوشل میڈیا غالب کا جو نیا خیالی دیوان تیار کررہا ہے وہ ادب کے شائقین کے لیے دردسر بن گیا ہے۔ مشاعروں کے شعرا سے اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنا پرانا کلام ہی ہر جگہ دہراتے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ سوشل میڈیا نے غالبؔ کا تازہ کلام پیش کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے۔ اب تو جس کی جو مرضی ہو وہ شعر گڑھ کر غالبؔ اور اقبالؔ کے نام سے منسوب کررہا ہے۔ سوشل میڈیا پر پوسٹ ہوتے ہی اس کی ترسیل چند منٹوں میں دور دور تک ہوجاتی ہے۔ 'فری فال آل' کی یہ صورت حال فی الحال بظاہر لاعلاج مرض کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ کسی جمہوری معاشرے میں ہم اظہار رائے پر پابندی عائد نہیں کرسکتے لیکن آئین اور قانون بھی کسی بات کی بے لگام آزادی نہیں دیتے۔ جہاں ایک طرف اردو شعر وادب کا حلقہ وسیع ہونا خوش آئند بات ہے وہیں صحت زبان اور صحیح اشعار کی ہی شمولیت کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ اردو رسم الخط سے ناواقف غالب کے شائقین کے لیے غالب کے مکمل دیوان کا معیاری ہندی ایڈیشن پرنٹ اور آن لائن دونوں شکل میں دستیاب ہو۔ انفرادی طور پر سوشل میڈیا پر غلط پوسٹ کرنے والوں کی باز پرس شاید عملی طور پر ممکن نہ ہو لیکن الیکٹرانک میڈیا کے جو مشہور ومعروف ادارے اپنے چینلوں پر پرائم ٹائم میں غالب سے منسوب غلط، بے معنی اور لغو اشعار کو بڑی شدومد کے ساتھ پیش کررہے ہیں ان کو یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ غالب کے نام پر کیا کیا اغلاط سرکررہے ہیں۔

لیکن ان اغلاط سے قطع نظر، غالب کی مقبولیت کا یہ بھی ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ عہد حاضر، کلام غالب کو اپنی نظر سے دیکھ کر غالب کی ازسرنو تشریح میں ہماری مدد کررہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس دل تھا لیکن غالب نے اسے ذہن عطا کیا۔ غالب کی شاعری کا جو پہلو جدید ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ شاعر کا وہ رویہ ہے جس کے تحت وہ زندگی کا نظارہ دور بیٹھے ایک ایسے تماشائی کی طرح کرتا ہے جو اس تماشے میں شامل ہوکر بھی اس سے بے تعلق ہے۔ غالب کے یہاں تشکیک کا عنصر بھی نمایاں ہے جو ہمیں عقائد، نظریات یا حقائق کو آنکھیں بند کرکے تسلیم کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ غالب نہ مشرق ومغرب کا تعصب رکھتے ہیں اور نہ شیخ وبرہمن کی تفریق کرتے ہیں۔ یہ بات بھی جدید ذہن کے لیے کشش رکھتی ہے۔

دوسری طرف، جو جو لوگ جاگیردارانہ معاشرے کے پروردہ غالب کو شخصی طور پر اپنے اخلاقیات کے پیمانوں سے ناپ رہے ہیں انہیں بھی یہ بات ذہن نشیں رکھنی ہوگی کہ ادب کی دنیا کا بنیادی سروکار، فنکار کا فن ہے۔ شاعر کی فنی خوبیاں ہی اس کے کلام کو زندہ رکھتی ہیں۔ بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے شاعر سے تعارف کا بنیادی حوالہ اس کے اشعار ہوتے ہیں۔ ماضی کی کوئی شخصیت حال کے پیمانوں پر کھری اترے اور اس کے عقائد اور اخلاقیات کے پیمانے ہمارے جیسے ہوں یہ ضروری نہیں ہے۔

**حسن ضیاء**

ڈاکٹر جمال اویسی

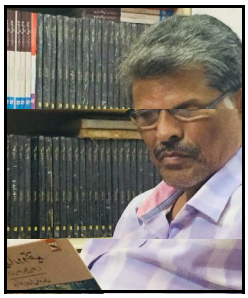

# مجنوں گورکھپوری اور غالبؔ

**مرزا** غالب کے ساتھ ہمارے دانشور نقاد مجنوں گورکھپوری کا رشتہ مختلف الجہت ہے۔ یہ رشتہ کبھی شاعر اور قاری کی طرح نظر آتا ہے تو کبھی تخلیق کار اور تخلیق کار کی جوڑی بن جاتا ہے۔ پھر ایک جہت سے رشتہ کبھی شاعر اور ناقد کی طرح مستحکم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجنوں صاحب کی پتلی سی کتاب (جو پہلے ایک تقریر تھی بعد میں تحریر میں تبدیل ہوئی) غالب کے فکری سرچشموں تک رسائی حاصل کرنے کی ممکن بھر کوشش ہے جس میں خود مجنوں صاحب کے تخلیقی وفور نے وہ کمال دکھایا ہے کہ تخلیقی تنقید کی زندہ مثال سامنے آ گئی ہے۔ غالب کو گذرے ہوئے 150 سال ہونے والے ہیں (فروری 2019)۔ مجنوں صاحب کے انتقال کو بھی ایک مدت ہوگئی۔ آج اردو تنقید کی صورتحال کچھ ایسی ہے کہ انہیں کسی بہانے یاد کرنے کا موقع نہیں ہے، ہاں سوائے اس تخلیقی اور تنقیدی رشتے کے جو مجنوں گورکھپوری صاحب کا اپنے محبوب شاعر مرزا غالب سے تھا۔ غالب کے ضمن میں مجنوں صاحب کی کتاب ''غالب: شخص اور شاعر'' حالیؔ اور بجنوریؔ کی کتابوں: ''یادگار غالب'' اور ''محاسن کلام غالب'' کے بعد تیسری اساسی کتاب گردانی جانی چاہئے کہ اس کتاب نے پہلی مرتبہ غالب کے تاریخی شعور کی پڑتال کی اور غالب کے فکری سرچشموں کا سراغ بھی لگایا۔ غالب اور مجنوں کے تخلیقی وتنقیدی رشتوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے راقم الحروف اپنی ایک پرانی یاد کے وسیلے سے مجنوں صاحب کی فکری شخصیت اور شبیہ کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میرے بڑے ابا حضرت احسان دربھنگوی صاحب نے ایک نجی ادبی گفتگو میں مجھ سے کہا کہ وہ نیاز فتح پوری کے بڑے پرستار تھے لیکن جب انہوں نے مجنوں گورکھپوری کو پڑھا تو انہیں مجنوں صاحب نیاز صاحب سے زیادہ بہتر لگے۔ یہ بات بڑے ابا نے دو مختلف ادبی گفتگو میں ایک جیسے انداز میں دوہرائی۔ بہت زمانہ تک میں سمجھ نہیں سکا کہ ان دونوں کے افسانوں کے تعلق سے یہ بات کہی گئی تھی یا ان کی تنقیدی بصیرت کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا۔ جہاں تک نیاز صاحب کی تنقیدی حیثیت کا سوال ہے وہ معتبر ہے اور رسالہ ''نگار'' کے مدبر مدیر کا مرتبہ آج تک فراموش نہیں کیا جا سکا ہے۔ تو کیا بڑے ابا نے مجنوں صاحب کی تنقیدی کتابوں کے مطالعہ کی روشنی میں اپنی بات کہی تھی؟ ممکن ہے یہی سچ ہو کیوں کہ مجنوں صاحب کے تنقیدی وژن کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے، آج کے طلائی تمغہ تقسیم کرنے والی تنقید کی روشنی سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مجنوں صاحب کے تعلق سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''ادب، کلچر اور مسائل'' میں بہت خوب لکھا ہے:

> ''مجنوں صاحب خواہ کسی ادیب یا شاعر کے بارے میں لکھ رہے ہوں یا کسی ادبی وفکری مسئلہ پر اظہار خیال کر رہے ہوں ان کا ذہن صاف، ان کا نقطۂ نظر واضح اور ان کا اظہار شفاف رہتا ہے۔ وہ اپنی بات کو کم سے کم لفظوں میں بیان کرتے ہیں اور اچھی نثر لکھنے کی طرح ڈالتے ہیں۔ اس لئے ان کی سنجیدہ تنقیدی تحریریں ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں مطالعہ اور معلومات ایک جان ہوجاتے ہیں۔ ان کے ہاں استدلال ہوتا ہے، منطقی ربط ہوتا ہے، گہرا رچا ہوا مذاق ادب ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ سمت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجنوں صاحب نے اپنی تحریروں سے نئے اور پرانے لکھنے والوں کو بیک وقت متاثر کیا ہے۔ مجنوں صاحب نے تنقید کے ذریعہ ادب کی تفہیم اور ادب کے ذوق کو آگے بڑھایا اور نئی نسل کو منتقل کیا ہے۔ انہوں نے تخلیق میں تنقید کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔'' (ص-184)

خود مجنوں صاحب اپنی تنقید کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''مجھے بیباکی کے ساتھ کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا، سچ کو سچ جھوٹ کو جھوٹ، اصلیت کو اصلیت اور فریب کو فریب کہہ دینے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوا اور میری زبان اور میرے قلم نے اس معاملہ میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔''

(''ادب اور زندگی''، ص-26)

تنقید کے فن کے تعلق سے مجنوں صاحب کا نظریہ بالکل صاف ہے۔ وہ نقاد کے فرض سے آگاہ ہیں:

> ''شاعر کو نقاد سے مدد ملتی ہے۔ شاعر جس کام کو نہیں کر سکتا نقاد اس کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ شاعر کو اپنی کوشش اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ اس کی اچھائی کے پرکھنے میں دھوکا کھا سکتا ہے۔ نقاد اس کو اس دھوکے سے بچاتا ہے۔ تنقید نئی تخلیق کے لئے شمع راہ بنتی ہے۔''

(''ادب اور زندگی''، ص-38-37)

تنقید کا کام ادب کے رشتے کو وسیع کرنا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ ادب میں تازہ ہوائیں آتی رہتی ہیں جس کے دم سے تنقید کا کام جاری وساری رہتا ہے۔ مجنوں صاحب

صدر شعبہ اردو و فارسی، ایم آر ایم کالج، لال باغ دربھنگہ-846004 (بہار)
فون:7352284181 jamalowaisi44@gmail.com

نیاز فتح پوری کی طرح باغیانہ تیور نہیں رکھتے لیکن ان کے تنقیدی کارناموں کی تہہ میں جا کر دیکھئے تو آپ کو بہت سی مردہ روایات سے بغاوت بھی نظر آئے گی اور ایک صحیح سمت کی طرف چلنے والی ترقی پسندی بھی دکھائی دے گی۔ ملحوظ رہنا چاہئے کہ مجنوں گورکھپوری کا نام اردو ادب اور تنقید میں ایک ترقی پسند نقاد کے طور پر بھی لیا جاتا رہا ہے لیکن وہ دیگر ترقی پسند نقادوں کی طرح سخت گیر یا شدت پسند نہیں تھے۔

☆

مرزا غالب پر مجنوں گورکھپوری کی کتاب ''غالب: شخص اور شاعر'' نئے تخلیقی ابعاد دریافت کرنے کی کوشش ہے جس میں مجنوں صاحب کی زندگی بھر کا مطالعہ ادب سمٹ آیا ہے۔ یہ 126 صفحات پر مشتمل پتلی سی کتاب ہے جس میں ''غالب کا عہد اور غالب''، ''غالب: فکر و نظر''، ''غالب: انداز بیان''، ''غالب اور ہم'' اور ''حق تو یہ ہے'' کے عنوان سے پانچ ابواب شامل ہیں۔ خود مجنوں صاحب کو یہ شکایت رہی کہ جو شاعر ان کے ذہن و دل سے اتنا قریب رہا ہے اس پر ابھی تک کچھ کیوں نہیں لکھا ہے گرچہ اردو شاعری اور ادب کی شخصیات کے تعلق سے کیا کچھ تحریر نہیں کیا ہے۔ ''غالب: شخص اور شاعر'' شاید اس بات کی تلافی ہے کہ ان سمتوں کا جائزہ وہ پیش کر سکیں جن سمتوں میں وہ غالب کے ساتھ شریک سفر رہے ہیں۔ غالب اور اقبال اردو کے عظیم شعراء ہیں، اس میں کوئی کلام نہیں۔ کلیم الدین احمد کی تنقید نے ان شاعروں کی عظمت سے انکار کیا باوجود اس کے ان کی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ جو اسباب ان کی مقبولیت میں کارفرما رہے ہیں وہ کلیم الدین احمد کی محدود نظروں سے پوشیدہ ہی رہے لیکن مجنوں صاحب کی نگاہ تاریخ کے طویل سلسلہ پر جا پڑتی ہے اور وہ غالب کی شخصیت کو ان ہی کے شعر کی تشریح کے طور پر گویا پیش کر دیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعتراف غالب کے اس شعر کی تفہیم معلوم ہوتا ہے:

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

لکھتے ہیں:

''شخصیتیں ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ تاریخ کی مخلوق ہوتی ہیں، یعنی زمانہ کے کسی مخصوص دور کے مادی اور خارجی اسباب و عوامل جن میں اقتصادی حالات سماجی ہیئت قریب ترین ماحول کے مؤثرات سبھی شامل ہوتے ہیں، افراد کے کردار و مزاج کا رخ متعین کرتے ہیں اور ان کی شخصیتوں کی تشکیل و ترتیب میں دور تک حصہ لیتے ہیں۔ آج زندگی کے اس نظریہ سے شاید ہی کوئی دبستان یا کوئی فرد اختلاف کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔ اس لئے کہ یہ ایک حقیقت ہے جو مسلم ہو چکی ہے۔ لیکن حقیقتیں کبھی یک رخی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ اس حقیقت کا بھی ایک دوسرا رخ ہے۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ شخصیتیں پیدا کرتی ہے لیکن یہ بھی کچھ کم نہیں کہ بعض شخصیتیں تاریخ آفریں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے عہد کی مخلوق ہوتے ہوئے نئے عہد کی آفریدگار ہوتی ہیں۔ یہ عظیم اور توانا شخصیتیں زمانہ کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہوتی ہیں۔ وہ زمانہ سے صرف عبرت حاصل نہیں کرتیں بلکہ زمانہ کو نئی سمت میں موڑ دیتی ہیں۔ کارلائل اور اس کے ہمنواؤں کا خیال بھی بنیادی طور پر صحیح ہے کہ تاریخ ایک سلسلہ ہے ''عظیم شخصیتوں کے عظیم کارناموں کا''۔ ایسی ہی عظیم شخصیتیں نابغہ یا بطل یا جوہر قابل (Genius) کہلاتی ہیں۔ نابغہ کی نظر اپنے زمانہ پر ہوتی ہے۔ مگر وہ ایسی دوررس بصیرت بھی اپنے اندر رکھتا ہے جو اس کو اس قابل بناتی ہے کہ اپنے زمانہ کے نقائص کو سمجھے اور اس نئے زمانہ کا تصور کر سکے جو آنے والا ہے اور جو اس کے زمانہ کی خرابیوں اور خامیوں کو دور کر کے فلاح و ترقی کے نئے اسباب لانے والا ہے۔ نابغہ حال سے ناآسودہ اور خوش آئند مستقبل کا آرزومند اور منتظر ہوتا ہے۔ وہ مروجہ نصاب زندگی کو جب ناقص محسوس کرتا ہے تو اس سے انحراف یا بغاوت پر اپنے کو الہامی طور پر مجبور پاتا ہے۔ لیکن وہ محض بغاوت کے لئے بغاوت کرنا نہیں سکھاتا۔ اس کی بغاوت کا مقصد یہ ہوتا ہے وہ ایسے نظام زندگی کا تصور پیش کر سکے جو موجودہ اور گزشتہ دونوں سے جمیل ہو۔'' (ص-9)

مرزا غالب نے مروجہ نصاب زندگی کو جس قدر محسوس کیا اس سے بغاوت کرنا ان کی تخلیقی مجبوری بن گئی۔ اس لئے ان کی شاعری بھی رائج معنوں میں ویسی شاعری نہیں کہی جا سکتی جو محض محفلوں کو گرماتی ہے اور نمائشی کلچر کو آراستہ کرتی ہے۔ غالب نے اپنے زمانہ کے کئی طلسمات توڑے اور لوگوں کی نظریں جن روشنیوں سے خیرہ تھیں انہیں بے نقاب بھی کیا۔ گرچہ غالب شخصی طور پر بہت ٹوٹے رہے۔ انہیں نان شبینہ کی فکر بھی دامن گیر رہتی تھی۔ اپنی عزت کا خیال بھی اسی قدر رہتا تھا۔ انگریزوں سے تعلق کی بنا پر انہیں بدنامی بھی ملی۔ مجنوں صاحب اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''غالب پر آج کل ایک عام اعتراض یہ ہے کہ وہ انگریز حکام کی خوشامدیں کرتے تھے۔ ان کی شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ یہ کوئی بڑا جرم نہیں ہے۔ روزگار کی تلاش یا وظیفے کی طلب میں ہم آپ بھی یہی کریں گے۔ ہاں عنوان بدلا ہوا ہوگا۔'' (ص-28)

شاعر سماج کا فرد ہوتا ہے اور اس کی بھی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ سماج کے ہمرکاب نہیں ہوتا۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے تحفظ کے ساتھ ساتھ نئی قدروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ غالب نے بھی یہی کام اپنی شاعری سے لیا۔ البتہ شاعری میں جوان کی شخصیت کی شبیہ دکھائی دیتی ہے وہ ایک کھلے اور آزاد مرد کی ہے۔ یہ آزاد مرد پورے طور پر اقبال کے یہاں جلوہ گر ہوتا ہے جو بڑا ''حق بین و حق اندیش'' بن کر شاعری میں ابھرتا ہے۔ شاعر کا آزاد مرد ہونا اس کی شخصیت کی اصل پہچان ہے۔ مجنوں صاحب غالب کے اصل تشخص کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''ایک اردو شعر میں غالب اپنے کو کھلے الفاظ میں آزاد مرد کہتے ہیں اور اس کے صلے میں خدا سے اپنی مغفرت چاہتے ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو شاعری کی دنیا میں غالب سے بڑا مرد آزاد پیدا نہیں ہوا۔ یہی پر اعتماد اور بے درنگ آزادی ہے جو غالب کو زمانے سے بلند کیے ہوئے ہے۔'' (ص-29)

مجنوں صاحب غالب کی شخصی خوبیوں کے قائل ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب کی شخصیت پر فریفتہ ہیں۔ غالب کا کردار نہیں انسپائر بھی کرتا ہے اور شاعری کی تاریخ میں مراجعت بھی کرتا دکھائی دیتا ہے:

''غالب کے کردار کی ایک خصوصیت بہت اہم ہے جس کو ہم استقامت کہہ سکتے ہیں اور جو ہر حال میں قائم رہتی ہے۔ غالب نہ کبھی نشہ میں بہکے

نہ غصہ یا کسی اور جذبہ میں۔ وہ بڑے ظرف کے آدمی تھے اور کسی حالت میں بھی خود کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔'' (ص-15)

زندگی کے آداب کو برتنا غالب نے اپنے پیش روؤں سے سیکھا تھا اور یہ وہی پیش رو شعرا تھے جن کی تقلید سے ان کی شاعری چمکی تھی۔ غالب کے ذہن کی تراش خراش کرنے میں قدماء کا جس قدر رول رہا ہے اس کا احساس مجنوں صاحب کو بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالب قدما اور ان کے کارناموں کی عظمت وحرمت کے معترف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بیدلؔ، صائبؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، ظہوریؔ وغیرہ اور اردو میں میرؔ کی شاعری کا مرتبہ نہ پہچان سکتے۔ لیکن قدامت کو کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ متقدمین کے اکتسابات کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور نئی نسل کے ذہن کی تربیت میں ان سے کام لینا بہت ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن ان اکتسابات پارینہ کی پارینگی کو پہلے دور کر لینا بھی ان کے خیال میں ضروری تھا۔'' (ص-15)

غالب نے گویا استفادہ کے اس عمل میں خود تکفیری اور تنقیدی عمل سے کام لیا۔ آنکھ موند کر قدماء کے سرمائے کو اپنی آنکھ کا سرمہ نہیں بنایا۔ جدید دور میں انگریزی کے شاعر اور ناقد ٹی ایس ایلیٹ نے بھی اپنے مضمون ''روایت اور انفرادی صلاحیت'' میں قدماء کے تعلق سے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس کے یہاں یوروپی تہذیب کی بازیافت کے لئے آنکھ موند کر قدماء کی تقلید اور تقلیب کا پیغام ملتا ہے جس کے پیچھے ایلیٹ کے روایت آشنا ذہن سے زیادہ اس کی غلامانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے۔ غالب اردو میں جدید دور کے آغاز کا شاعر ہے اور جس کے یہاں جدید اردو شاعری کے اولین نقوش بھی پائے جاتے ہیں (شمس الرحمٰن فاروقی)۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس مرد آزاد نے اقبال کی شاعری میں جگہ پا کر مرد مومن یا مرد کامل کی تشکیل میں حصہ بھی لیا۔ ایک مرد مومن مرد آزاد بھی ہوتا ہے جس کی گردن پر ذمہ داریوں کا بوجھ دھرا ہوتا ہے۔ غالب کی حق گوئی یا بیباکی نے سرسید احمد خاں کو ماضی کے میناروں کے شمار سے مسائل جدید کی طرف موڑا اور جس نے حالیؔ جیسے نابغہ کی تربیت بھی کی۔ مجنوں غالب کے زمانے میں نہیں تھے لیکن ان کی غالب پرستی انہیں غالب سے بے حد نزدیک کر دیتی ہے۔ حالیؔ کی عقیدت مندی نے ''یادگار غالب'' لکھوایا۔ مجنوں صاحب کی غالب فہمی نے ''غالب: شخص اور شاعر'' لکھوائی۔ اس غالب فہمی میں غالب پرستی بھی چلی آئی ہے جو بیجا نہیں ہے۔ ایک بڑا تخلیق کار جب دوسرے تخلیق کار کو مس کرتا ہے تو اپنا سب کچھ اس کے اندر ڈال دیتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری غالب جیسے نابغۂ روزگار کو تاریخ، تہذیب، شعریات کی روشنی میں تو دیکھتے ہی ہیں نفسیات، سماجیات اور دیگر متداول علوم کی روشنی میں بھی پرکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ حالی کی شخصیت پرستی کے اکہرے پن سے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور بجنوریؔ کی تقابلی تنقید کی تاثراتی فضا سے بلند ہو کر تخلیقی تنقید کی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھئے کہ غزل کی ہیئت کے وسیلے سے وہ شعور کی رو تک جا پہنچتے ہیں۔ غزل کے سلسلے میں مجنوں صاحب کی یہ صراحت کلیم الدین احمد کی تنقید کو آئینہ دکھانے کے لئے کافی ہے:

''غالب دنیا کے ہر بڑے شاعر کی طرح بنیادی طور پر داخلی صنف کے شاعر تھے اور اس صنف میں بھی تحتی صنف کے شاعر تھے جس کو غزل کہتے ہیں اور جو فارسی اور اردو کے سوا دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ غزل میں کوئی وحدت نہیں ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل اور منفرد مضمون اور اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے اور بظاہر پوری غزل میں وحدت نظر نہیں ہوتی لیکن حقیقتاً اس میں بڑی دقیق وحدت ہوتی ہے اور یہ وحدت مرکب اور پیچیدہ ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے ایک غزل ایک ہی شاعر کی کہی ہوتی ہے اور اس کے مزاج کے کئی رخ سے آئینہ دار ہوتی ہے۔ غزل سے شاعر کی پوری فردیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر غزل میں قافیہ کی وحدت ہوتی ہے اور سب سے پہلے تو اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کون صرف قافیہ بند شاعر ہے اور کس کا ذہن ایک قافیہ سے کسی خاص معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ قافیے ایتلافات ذہنی (Mental association) کا بہترین امتحان ہیں اور ان سے شاعر کے پورے شعور کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے علی گڑھ میں ایک مرتبہ ایم اے کے طلبا سے کہا تھا کہ شعور کی رو (Stream of Consciousness) کو سمجھنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی نہایت معصوم اور بے ساختہ مثال غزل ہے۔ ہم مجمل طور پر کہہ سکتے ہیں کہ غزل میں ''شعور کی رو'' کی وحدت ہوتی ہے۔'' (ص-33)

''ادب اور زندگی'' میں مجنوں صاحب نے لکھا تھا کہ 'شاعر جس کام کو نہیں کر سکتا نقاد اس کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ شاعر کو اپنی کوشش اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ اس کی اچھائی یا برائی کے پرکھنے میں دھوکا کھا سکتا ہے۔ نقاد اس کو اس دھوکے سے بچاتا ہے۔ تنقید نئی تخلیق کے لئے شمع راہ بنتی ہے۔' اس قول کی روشنی میں غالب تو نہیں خود مجنوں گورکھپوری کی پوری ادبی شخصیت اچھل کر سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً مجنوں صاحب کا تنقید کے منصب سے آگاہ ہونا اور تنقید کی کارکردگی کی حدود سے واقف ہونا۔ تنقید تخلیق کار کے لئے شمع راہ بنتی ہے، یہ بات مجنوں صاحب سے پہلے نہ حالیؔ نے کہی اور نہ بجنوریؔ نے۔ حتیٰ کہ یہ بات نیاز فتح پوری کے قلم سے بھی نہیں نکلی۔ غلام رسول مہر، شیخ اکرام آئی سی ایس، سید عبداللطیف وغیرہ نے بھی غالب پر لکھا تھا لیکن کسی کے ذہن میں یہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ مجنوں گورکھپوری نے ایسا لکھ کر جدید دور میں ظہور میں آنے والی نئی تنقیدی تھیوری کی طرف اشارہ کر دیا۔ کم از کم میں ذاتی طور پر اسے ''امتزاجی تنقید'' یا ''تخلیق شعار تنقید'' کا پیش خیمہ سمجھنے کے لئے مجبور ہوں۔

☆☆☆

## ضروری اطلاع

اب اعزازیہ کی رقم ای سی ایس (ECS) کے ذریعے بینک کھاتے میں بھیجی جاتی ہے چیک سسٹم ختم ہو چکا ہے۔ آپ کی تخلیق 'آجکل' کے جس شمارہ میں شامل ہوئی ہے وہ شمارہ ملتے ہی ہمیں اپنی بینک کھاتے کی ڈیٹیل یعنی پاس بک کے صفحہ اول کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک کی کاپی اور پین کارڈ کی کاپی فوری طور پر ای میل کریں یا ڈاک سے بھیجیں۔ مطلوبہ چیزیں دس پندرہ دنوں کے اندر اندر ہمیں موصول ہو جانی چاہئیں۔ بروقت موصول نہ ہونے کی صورت میں اعزازیہ کی رقم آپ کے کھاتے میں نہیں پہنچ پائے گی۔ (ادارہ)

ابراہیم افسر

# مرزا غالبؔ اور دبستانِ میرٹھ

**دبستان** میرٹھ کی ادبی شان وشوکت اور اس خطۂ ارض کے جاہ وجلال پر بات کرنے سے قبل اخترؔ چغتائی میرٹھی کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

نازشِ عظمت ہے تو، گہوارۂ فطرت ہے تو　　جانِ شعریت ہے تو، آغوشِ حریت ہے تو
خاکِ میرٹھ! تیرے ہر ذرّے پہ نازاں کائنات　　گلشنِ گیتا ہے تو، گل دستۂ جنّت ہے تو

شاعرِ انقلاب عبدالقیوم قریشی کوثرؔ میرٹھی نے اس شہر کی عظمت وتقدس اور حریت و جرأت نوازی کو اپنے اشعار میں یوں بیان کیا:

اے زمیں، اے خطۂ میرٹھ! تجھے صد آفریں　　جی میں آتا ہے کہ بڑھ کر چوم لوں تیری جبیں
حریت کے نقش ہیں تیری مُقدس خاک پر　　دنگ ہے تاریخ تیری جرأتِ بے باک پر

شمالی ہند کا یہ تاریخی شہر قدیم زمانے سے ہی اپنی علاحدہ سیاسی ولسانی شناخت کے ساتھ ادبی وقار وافتخار بنائے ہوئے ہے۔ ''کھڑی بولی'' کے اس خاص علاقہ نے اُردو زبان وادب کی آب یاری اور فروغ میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے شہرِ میرٹھ نے لاتعداد قربانیاں بھی دیں۔ شہرِ میرٹھ کی قربانیاں اور حریت نوازی کے واقعات ہندوستانی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حرفوں میں درج ہیں۔ اس بنا پر شہرِ میرٹھ کو ''عروس الاحرار'' اور ''نفیرِ آزادی'' جیسے اعزازی خطابات سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے سنجیدہ قاری اس بات سے بہ خوبی واقف ہیں کہ عہدِ رامائن اور مہابھارت کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے آثارِ قدیمہ کے نشانات آج بھی اس خطّے میں موجود ہیں۔ اُردو ادب کے اوراق پلٹنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ کا ایک نام ''عشق آباد'' بھی تھا۔ میرٹھ شہر کی تاریخ وتہذیب پر تحقیقی کام کر رہے انیس احمد حسینی انیسؔ میرٹھی نے اپنے غیر مطبوعہ مقالے ''میرٹھ کی کمبوہ ریاست تاریخ کے آئینے میں'' اس فصیل بند شہر کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا:

> ''شمالی ہندوستان کا گنگا جمنا کے دوآبے کے درمیان میں سرسبز وشاداب اور مردم خیز خطّہ ہے جسے ماہرین لسانیات نے اُردو زبان وادب کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ ناقدین، محققین اور زبان دانی کے مبصرین کے معتبر بیانات کی روشنی میں میرٹھ کو ''کھڑی بولی'' کا مسکن اور اس کے نکھرے ہوئے روپ کا بنیادی علاقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہاں کی مٹی میں اگر قومی یک جہتی کے عناصر شامل ہیں تو یہاں کی تہذیب وثقافت میں گنگا جمنی تہذیب کے نقوش بھی روشن ہیں۔ اس انقلابی خطے نے وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے وہ بے باکانہ، مجاہدانہ کردار ادا کیا کہ اہلِ دانش اور مفکرینِ جہاں نے اسے ''عروس الاحرار'' اور ''نفیرِ آزادی جیسے اعزازی خطابات سے نوازا۔ آریہ اور شاہی تہذیب وتمدن میں دستاویزی شان وشوکت رکھنے والا یہ تاریخی علاقہ ادب العالیہ کی قدیم روایت کا امین وترجمان وپاسبان بھی ہے۔''
> (میرٹھ کی کمبوہ ریاست تاریخ کے آئینے میں، غیر مطبوعہ مضمون، صفحہ اول)

جیسا کہ ماقبل تحریر کر چکا ہوں کہ دوآبہ اور سرزمینِ میرٹھ اُردو ادب کے لیے بڑی ہی زرخیز رہی ہے۔ اپنے علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے اس شہر کو دبستان کا درجہ حاصل ہوا۔ معاملہ چاہے شعرفہمی کا ہو یا نثری پاروں کی پرکھ کا، تنقید کا ہو یا تحقیق کا یا اُردو زبان و ادب کے فروغ کا، دبستانِ میرٹھ نے اپنے ادبی کارہائے نمایاں سے اُردو ادب کو نئی سمت، جہت اور رفتار عطا کی۔ انھیں ادبی کارناموں کی وجہ سے اُردو ادب میں اس خطۂ ارض کو منفرد مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔ انیسویں صدی میں میرٹھ کی سرزمین میں ایک سے بڑھ کر ایک نثار، شعرا، ناقدین، محققین، مبصرین، تذکرہ نویس اور ماہرِ لسانیات نے آنکھیں کھولیں۔ الغرض! اس شہر میں ادبی شعور اور ذوق وشوق ابتدا سے ہی تھا۔ انیسویں صدی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ اُردو ادب کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب میں منفرد اور اعلا مقام ومرتبہ حاصل کر چکے ہندوستان کے مایہ ناز شاعر اور نثار مرزا اسداللہ خاں غالب نے ہندوستان کے جن شہروں مثلاً آگرہ، دہلی، لوہارو، بنارس، الٰہ آباد،، بھوپال، فیروز پور، رام پور، مراد آباد، سکندر آباد، بلند شہر، کلکتہ وغیرہ کے بعد جس شہر کو عموماً اپنی زندگی کے آخری عشرے اور بالخصوص تحریروں میں یاد کیا وہ شہر میرٹھ ہے۔ شہر میرٹھ میں اُس وقت مرزا غالبؔ کے مداحین، ناقدین اور قدر شناسوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ مرزا غالبؔ کے کلام نے شہر میرٹھ میں ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مرزا غالبؔ کے اشعار کے اولین شارح مولانا شوکتؔ میرٹھی (1839-1922) بھی یہیں پیدا ہوئے۔ مولانا شوکت میرٹھی نے مرزا غالبؔ کے ایک شعر کے کئی مطالب ومفاہیم بیان کیے۔ یہاں تک کہ مرزا غالبؔ کی کتاب ''قاطع برہان'' کے جواب میں ''ساطع برہان'' مرزا رحیم بیگ (1821-1876) نے میرٹھ میں لکھی۔ مرزا غالبؔ کے تلامذہ فصیح الدین رنجؔ میرٹھی (1836-1885)، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ (1806-1899) اور مولوی اسماعیلؔ

وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سیوال خاص، میرٹھ (یوپی) 250501
فون: 9897012528 ibraheem.siwal@gmail.com

میرٹھی(1844-1917) کا تعلق بھی سرزمینِ میرٹھ سے تھا۔مرزا غالبؔ کے خطوط کے پہلے مجموعے ''عود ہندی'' پر تقریظ لکھنے والے حکیم مولا بخش قلقؔ میرٹھی (1833-1880) نے بھی سرزمین میرٹھ کو اپنا کارِ گہہ عمل بنایا۔سب سے بڑی بات مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ 1857 کے ناکام انقلاب کے بعد اپنے سب سے چہیتے، ہر دل عزیز اور محسن شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ سے ملنے کے لیے میرٹھ تین مرتبہ تشریف لائے۔دبستان میرٹھ کو مرزا غالبؔ کے اولین مکاتیب ''عود ہندی'' کی اشاعت کا بھی شرف حاصل ہے۔عود ہندی کو سرزمین میرٹھ سے 27 اکتوبر 1868 میں رئیس میرٹھ حاجی ممتاز علی خاں نے ترتیب دے کر مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع کروایا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے اپنے عہدِ طفلی کے کچھ ایام میرٹھ میں گزارے تھے۔الطاف حسین حالیؔ کے مطابق چچا نصر اللہ بیگ کے انتقال کے بعد غالبؔ اپنے نانا غلام حسین کی سرپرستی میں آ گئے جو میرٹھ کی سرکار میں فوج کے کمیدان (نائب کپتان) تھے لہٰذا کوئی وجہ نہیں غالبؔ ان کے پاس میرٹھ میں نہ رہے ہوں۔مرزا غالبؔ نے جو خطوط اپنے احباب کو لکھے ان میں بھی میرٹھ کے قیام کی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے گئے خطوط اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مرزا غالبؔ جب رام پور کے سفر کے لیے گئے تو میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں آرام کیا تھا۔مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام 26 جنوری 1859 چہار شنبہ کو لکھے گئے خط میں، میرٹھ میں قیام کی وجہ اور وہاں گزارے ہوئے ایام کی تعداد کا تذکرہ دل چسپ انداز میں کیا گیا ہے۔مرزا غالبؔ کا خط ملاحظہ کیجیے:

''صاحب! تمہارا خط مع رقعۂ مرد سخن فہم پہنچا۔تمہاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمہارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔جواب میں دیر اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیلِ ڈاک میرٹھ گیا تھا تین دن وہاں رہا، کل وہاں سے آیا۔آج تم کو یہ خط بھجوایا۔''

(غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد اوّل، 2011، صفحہ 309)

مرزا غالبؔ نے جنوری 1859 کو مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھے خط میں میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے بارے میں لکھا:

''صاحب! میرٹھ سے آ کر تم کو خط لکھ چکا ہوں، شاید نہ پہنچا ہو، اس واسطے از روئے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بہ سبیل ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبے کے دن دلّی آ گیا اور چار شنبے کے دن تم کو خط بھیجا۔''

(غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، جلد اوّل، 2011، صفحہ 309)

مرزا غالبؔ، اپنے عزیز و اقارب کے میرٹھ آنے جانے اور وہاں ٹھہرنے پر نگاہ رکھتے تھے۔جب مرزا ہرگوپال تفتہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملنے کے واسطے میرٹھ گئے تو اس بات کی جان کاری مرزا غالبؔ کو ہو چکی تھی، جس کا تذکرہ انھوں نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام جمعہ 23 دسمبر 1859 کو لکھے خط میں یوں کیا:

''تمہارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا، ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔''

(غالب کے خطوط، جلد اوّل، 2011، صفحہ 318)

دراصل نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیر انگریز حکومت نے دورانِ غدر، حفاظت نہ کرنے کے سبب، الزام عائد کر ضبط کر لی تھی اور سات برس کی سزا کا بھی حکم انھیں ملا۔شیفتہ، انگریزوں کے اس رویے سے بہت خفا اور نالاں ہوئے۔دہلی چھوڑ کر میرٹھ میں سب سے پہلے اپنے بھتیجے داماد محمد عماد نبی خاں سنبھلی کے یہاں، پھر حاجی ممتاز علی کمبوہ کے پاس مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔یہ علاقہ چھتہ ممتاز علی، خیر نگر بازار، میرٹھ کے نام سے مشہور ہے۔شیفتہ کے مکان سے ملحق دیوان خانہ تھا۔اسی دیوان خانے میں مرزا غالبؔ کو قیام میرٹھ کے دوران ٹھہرایا گیا۔مرزا غالبؔ نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام چاشتگاہ شنبہ 21 جنوری 1860 کو ایک خط اور لکھا جس میں انھوں نے اس بات کو واضح کیا کہ وہ رام پور جاتے ہوئے میرٹھ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکان پر رُکے تھے۔دراصل مرزا غالبؔ نے اس خط میں رام پور کے سفر کی روداد کو بیان کیا ہے۔خط ملاحظہ کیجیے:

''بھائی! میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔پنجشنبہ انیس کو مراد نگر اور جمعے بیس کو میرٹھ پہنچا۔آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے قیام کیا۔یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکتیشر ہوں گا۔پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔باقی جو کچھ لکھنا ہے وہ رام پور سے لکھوں گا۔''

(غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم،، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد اوّل، 2011، صفحہ 318)

اس طرح مرزا غالبؔ نے میرٹھ میں پہلی مرتبہ 22 جنوری 1859 سے 25 جنوری 1859 تک قیام کیا۔دوسری مرتبہ رام پور جاتے ہوئے ایک روز کے لیے 21 جنوری 1860 کو قیام کیا۔تیسری مرتبہ رام پور سے واپس آتے ہوئے 24 مارچ 1860 کو میرٹھ میں قیام کیا۔مرزا غالب نے 2 فروری 1859 بروز بدھ کو ایک طویل خط میر مہدی مجروح کے نام تحریر کیا۔جس میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیر کو انقلاب 1857 کے ہنگامے میں انگریزوں کے ذریعے ضبط کر لینے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ساتھ ہی مرزا غالبؔ نے اپنے قیامِ میرٹھ کے ایام اور نواب شیفتہ کے یہاں ٹھہرنے کی تفصیل بھی تحریر کی۔مرزا غالبؔ لکھتے ہیں:

''سید صاحب! نہ تم مجرم نہ میں گنہگار۔تم مجبور میں ناچار۔لو اب کہانی سنو۔میری سرگذشت میری زبانی سنو۔نواب مصطفےٰ خاں بہ میعاد سات برس قید ہو گئے تھے، سو اُن کی تقصیر معاف ہوئی اور اُن کو رہائی کا حکم آیا ہے۔جہاں گیر آباد کی زمین داری اور دلّی کی املاک اور پینشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔میں یہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔اُن کو دیکھا۔چار دن وہاں رہا۔پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔دن و تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتے کو گیا، منگل کو آیا۔آج بدھ دوم فروری ہے۔مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اُس کا جواب لکھا جائے۔آج صبح کو تمھارا خط آیا، دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اِس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

''میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ

گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔''

(غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد دوم، 2006، صفحہ 501)

مرزا غالبؔ نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام یک شنبہ 20 جنوری 1861 کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں مرزا ہرگوپال تفتہ کو ''مراۃ الصحائف'' کے تماشے اور ''سنبلستان'' کی اشاعت پر پیشگی مبارک باد دی۔ ساتھ ہی میرٹھ میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے موجود ہونے اور یہاں پر مصطفےٰ خاں بہادر سے ملاقات ہونے پر مرزا غالبؔ کا سلام پہنچانے کی بات کہی گئی۔ خط ملاحظہ کیجیے:

''صاحب! تمہارا خط میرٹھ سے آیا۔ ''مرآۃ الصحائف'' کا تماشا دیکھا۔ ''سنبلستان'' کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے، اور خدا ہی تمہاری آبرو کا نگہبان رہے.... جناب بھائی صاحب یعنی مصطفےٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔''

(غالب کے خطوط، جلد اوّل، 2011، صفحہ 326-325)

محمد مشتاق شارقؔ میرٹھی نے اپنی کتاب ''میرٹھ کی ادبی خدمات'' میں مرزا غالبؔ کے دبستانِ میرٹھ سے ادبی تعلقات پر تفصیلی مواد فراہم کیا ہے۔ محمد مشتاق شارقؔ نے مکاتیب غالب کی اولین اشاعت اور حاجی ممتاز علی خاں کی کاوشوں کو منظر عام پر لاتے ہوئے لکھا کہ ''رقعاتِ غالبؔ کا پہلا مجموعہ 'عود ہندی' 27 اکتوبر 1868 کو مرزا کی وفات سے چار ماہ قبل مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس میں ممتاز علی کا پیش لفظ، سرورؔ کا دیباچہ اور قلقؔ اور ان کے شاگردوں کے قطعات تاریخ شامل ہیں۔'' اس بارے میں محمد مشتاق شارقؔ نے مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا:

''رقعات کے ساتھ منشی ممتاز علی نے غالبؔ کے کلیات کی اشاعت کی تحریک بھی شروع کر دی تھی جسے چھاپنے کے لیے منشی عظیم الدین کتب فروش تیار تھے، مگر بعض مصالح کی بنا پر غالبؔ نے میرٹھ میں دیوان کے انطباع کو پسند نہ کیا، بعد میں یہ دیوان 29 جولائی 1861 کو مطبع احمدی واقع شاہدرہ (دہلی) میں مطبوع ہوا۔''

(میرٹھ کی ادبی خدمات، محمد مشتاق شارقؔ، 2014، صفحہ 88-87)

محمد مشتاق شارقؔ نے مرزا غالبؔ کے میرٹھ میں قیام اور رقعات غالبؔ کی طباعت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مزید تحریر کیا:

''غالبؔ کی میزبانی کا شرف شیفتہ کو حاصل تھا، حاجی ممتاز علی کمبوہ اپنے چھتّے واقع خیر نگر میرٹھ میں رہتے تھے، غدر کے بعد جب شیفتہ میرٹھ منتقل ہوئے تو حاجی ممتاز علی نے جو شیفتہ کے عزیز بھی تھے، اپنا مکان ان کے قیام کے لیے دے دیا، شیفتہ جس مکان میں ٹھہرائے گئے اس میں اب حمیدیہ گرلز جونیر ہائی اسکول قائم ہے، اس سے ملی ہوئی ان کی بیٹھک تھی جو غالبؔ کو ٹھہرانے کے لیے دی گئی، یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ منشی ممتاز اور حاجی ممتاز علی دو علاحدہ علاحدہ شخصیتیں ہیں، منشی ممتاز علی مطبع مجتبائی کے مالک تھے اور حاجی ممتاز علی رئیس میرٹھ و اٹاوہ، عود ہندی کی اشاعت کی تحریک حاجی ممتاز علی کی طرف سے ہوئی۔ حاجی ممتاز علی کو شعر و ادب سے کم دل چسپی تھی وہ سرکاری عمارتوں کی ٹھیکے داری کا کام کرتے رہتے مگر غالبؔ کے پرستاروں میں سے تھے، اسی باعث غالبؔ کے خطوط کی اشاعت کی ذمہ داری انھوں نے قبول کی اور عود ہندی کی دوسری فصل کی ترتیب میں حصہ لیا، چوں کہ ان کے تعلقات وسیع تھے اس لیے ان کی تحریک سے غالبؔ کے خطوط مختلف جگہوں سے فراہم ہوئے۔''

(میرٹھ کی ادبی خدمات، محمد مشتاق شارقؔ، 2014، صفحہ 88)

منشی ممتاز علی خاں مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کو میرٹھ سے شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس کام میں منشی ممتاز علی نے عظیم الدین کتب فروش میرٹھی کو مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کی طبع و اشاعت کے لیے تیار کیا تھا۔ لیکن میرٹھ کی قسمت میں اس دیوان کی اشاعت نہ تھی۔ مرزا غالبؔ کے اس سے قبل اُردو دیوان کے دو ایڈیشن 1841 اور 1847 میں شائع ہو چکے تھے۔ مرزا غالبؔ نے منشی شیو نارائن آرام کے نام اپریل 1860 میں اس بابت ایک تفصیلی خط تحریر کیا۔ جس میں منشی ممتاز علی خاں کی اُردو دیوان کی اشاعت سے متعلق بہت سی باتوں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ مرزا غالبؔ کی خواہش تھی کہ ان کا اُردو دیوان دہلی کے کسی مشہور پریس سے چھاپا جائے۔ لیکن منشی ممتاز علی خاں کے استفسار کو وہ ٹال نہ سکے اور اپنا اُردو دیوان رام پور میں قیام کے دوران کاتب سے لکھوا کر میرٹھ بھجوایا۔ جہاں پر اس دیوان کی تصحیح کا ذمہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے مرزا غالبؔ کے اصرار پر قبول کیا۔ ان مذکورہ بالا تمام امور پر تفصیل سے مرزا غالبؔ نے لکھا:

''میاں! دیوان کے میرٹھ میں چھاپے جانے کی حقیقت سُن لو؛ تب کچھ کلام کرو۔ میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا، سرنامے پر لکھا تھا: ''عرض داشت عظیم الدین احمد، من مقام میرٹھ۔'' واللہ باللہ، اگر میں جانتا ہوں کہ عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے۔ بہ ہر حال پڑھا۔ معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور فائدہ اُٹھانے کے واسطے چھاپنا چاہتے ہیں۔ خیر، چپ رہا۔ جب میں رام پور سے میرٹھ آیا، بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں اُترا۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوستِ قدیم مجھ کو ملے، انھوں نے کہا کہ اپنا اُردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجیے گا۔ عظیم الدین ایک کتاب فروش، اُس کو چھاپنا چاہتا ہے۔ اب تُم سنو، دیوان ریختہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں غدر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلّی سے رام پور جانے لگا، تو بھائی ضیاء الدین صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوانِ اُردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیلِ ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلّی بھیج دیا تھا۔

آمدم برسرِ مدعا سابق۔ اب جو منشی ممتاز علی صاحب نے مجھ سے کہا تو مجھے یہی کہتے بن آئی کہ اچھا، دیوان تو میں ضیاء الدین خاں سے لے کر بھیج دوں گا، مگر کاپی کی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ نواب مصطفےٰ خاں نے کہا کہ ''میں''۔ اب کہو میں کیا کرتا؟ دلّی آ کر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر، ایک آدمی کے ہاتھ نواب مصطفےٰ خاں کے پاس بھیج دیا۔ اگر میں اپنی خواہش سے چھپواتا تو اپنے گھر کا مطبع چھوڑ کر پرائے چھاپے خانے میں کتاب کیوں بھجواتا؟ آج اس وقت میں نے تم کو یہ خط لکھا اور اسی

وقت بھائی مصطفےٰ خاں صاحب کو ایک خط بھیجا ہے اور اُن کو لکھا ہے: ''اگر چھاپا شروع نہ ہوا ہو، تو نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے؛ اگر دیوان آ گیا تو فوراً تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ اور اگر وہاں کاپی شروع ہوگئی ہے تو میں ناچار ہوں، میرا کچھ قصور نہیں ہے۔ اور اگر سر گذشت کو بھی سن کر مجھ کو گناہگار ٹھہراؤ، تو اچھا، میرا بھائی، میری تقصیر معاف کیجیو۔ رمضان اور عید کا قصہ لگا ہوا ہے۔ یقین ہے کہ کاپی شروع نہ ہوئی ہو اور دیوان میرا میرے پاس آئے اور تم کو پہنچ جائے۔''

(غالب کے خطوط، جلد سوم، چوتھا ایڈیشن، 2016، صفحہ 1081 تا 1082)

مرزا غالبؔ کا یہ دیوان 29 جولائی 1861 میں شائع ہوا۔ لیکن منشی شیو نارائن آرام مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کو خود شائع کرنا چاہتے تھے۔ مرزا غالبؔ بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کا دیوان منشی شیو نارائن آرام ہی چھاپیں۔ لیکن اپریل 1860 سے لے کر 10 جنوری 1862 یعنی کم وبیش ایک سال نو مہینے میں بھی منشی شیو نارائن آرام مرزا غالبؔ کی دیرینہ خواہش کی تکمیل نہ کر سکے۔ مرزا غالبؔ نے اپنا اُردو دیوان میرٹھ سے واپس صرف اس لیے منگوایا تھا کہ اسے منشی شیو نارائن آرام بہتر طریقے یعنی عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کریں۔ دراصل مرزا غالبؔ نے اپنے دیوان کو میرٹھ میں سکندر شاہ کے ہاتھ مارچ 1860 کے اخیر میں بھیجا تھا۔ اس کی رسید مرزا غالبؔ کو بعد میں ڈاک سے موصول ہوئی۔ اس بارے میں مرزا غالبؔ نے 17 شوال 1276ھ مطابق 9 مئی 1860 کو یوسف مرزا کے نام تحریر کیے گئے خط کی اندرونی سطور میں لکھا کہ ''میرا اُردو کا دیوان میرٹھ کو گیا۔ سکندر شاہ لے گئے۔ مصطفےٰ خاں کو دے آئے۔ ڈاک میں اُس کی رسید آ گئی۔ نہ ''بُرہان قاطع'' نہ قاطعِ بُرہان۔'' (غالب کے خطوط، جلد دوم، صفحہ 783)۔ مرزا غالبؔ نے اپنے اُردو دیوان کو میرٹھ سے واپس منگوانے کے لیے ہر ممکن جتن کیا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام خطوط ارسال کیے کہ کسی بھی طرح ان کا اُردو دیوان میرٹھ سے واپس آ جائے۔ میاں داد خاں سیاحؔ کے نام دو شنبہ 11 جون 1860 کو لکھے گئے خط میں مرزا غالب نے عظیم الدین کتب فروش میرٹھی کو بھوت، پلید، غول اور نامعقول القاب و آداب سے نوازا۔ اس خط میں میرٹھ سے دیوان واپس منگوانے کی تفصیل مرزا غالبؔ نے کچھ اس طرح لکھی ہے:

''دیوان کا چھاپا کیسا؟ وہ شخص ناآشنا، موسوم بہ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان منگا بھیجا، آدمی نہیں ہے، بھوت ہے، پلید ہے، غول ہے، قصہ مختصر، سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اُس کے طور پر انطباعِ دیوان نامطبوع ہے۔ اب میں اُس سے دیوان مانگ رہا ہوں اور وہ نہیں دیتا۔ خدا کرے ہاتھ آ جائے، تم دعا مانگو۔ زیادہ کیا لکھوں؟''

(غالب کے خطوط، جلد دوم، 2006، صفحہ 547)

خداوند کریم نے رمضان المبارک کے مہینے میں مرزا غالب کی اس دعا کو قبول کیا اور محض کچھ دن بعد ہی مرزا غالب کا اُردو دیوان ان کے پاس میرٹھ سے واپس دہلی آ گیا۔ مرزا غالب نے عید کے دن یعنی شنبہ روز عید مطابق 30 جون 1860 کو یہ خوش خبری میاں داد خاں سیاحؔ کو یوں سنائی:

''میں بہت خوشی سے تم کو یہ اطلاع دیتا ہوں کہ اُردو کا دیوان غاصبِ نا انصاف سے ہاتھ آ گیا اور میں نے نورِ چشم منشی شیو نارائن کو بھیج دیا۔ یقین کلّی ہے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔''

(غالب کے خطوط، جلد دوم، 2006، صفحہ 548)

مرزا غالب نے اپنے اُردو دیوان کی اشاعت میں ہو رہی تاخیر کے سلسلے کے ساتھ اپنی ناراضگی اور خفگی کا برملا اظہار منشی شیو نارائن آرام کے نام 10 جنوری 1862 کو لکھے خط میں کیا۔ جس میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ مرزا غالبؔ نے منشی ممتاز علی خاں سے اپنا اُردو دیوان اس لیے واپس لے لیا تھا کہ منشی شیو نارائن آرام کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ ان کے رہتے مرزا غالبؔ کا اُردو دیوان میرٹھ سے شائع ہو۔ منشی شیو نارائن کی ناراضگی کو دور کرتے ہوئے مرزا غالب اس خط میں رقم طراز ہیں:

''میاں! میں جانتا ہوں کہ مولوی میر نیاز علی صاحب نے وکالت اچھی نہیں کی۔ میرا مدعا یہ تھا کہ وہ تم پر اس امر کو ظاہر کریں کہ دلّی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اُس سے شروع ہوا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب تمھارا بھیجا ہوا فرمایا مجھ کو دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی، یہ سمجھ کر دی تھی کہ اب تمھارا ارادہ اس کو چھاپنے کا نہیں۔ غور کرو، میرٹھ کے چھاپے خانے والے محمد عظیم نے کس عجز و الحاح سے دیوان لیا تھا اور میں نے نظر تمھاری ناخوشی پر یہ جبر اس سے پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں؟ تم نے خط لکھنا موقوف کیا، میں سمجھتا ہوں کہ تم خفا ہو۔ میں نے مولوی نیاز علی صاحب سے کہا کہ برخوردار شیو نارائن سے میری تقصیر معاف کروا دینا۔

بھائی، خداوند کی قسم میں تم کو اپنا فرزند دلبند سمجھتا ہوں۔ اس دیوان اور تصویر کا ذکر کیا ضرور ہے؟ رام پور سے وہ دیوان صرف تمھارے واسطے لکھوا کر لایا۔ دلّی میں تصویر بہ ہزار جستجو بہم پہنچا کر مول لی اور دونوں چیزیں تم کو بھیج دیں۔ وہ تمھارا مال ہے، چاہو اپنے پاس رکھو، چاہے کسی کو دے ڈالو۔ چاہو پھاڑ کر پھینک دو۔''

(غالب کے خطوط، جلد سوم، چوتھا ڈیشن، 2016، صفحہ 1084)

لیکن منشی شیو نارائن کی قسمت میں مرزا غالبؔ کے اُردو دیوان کی اشاعت کا حق نہیں تھا۔ غالبؔ کے اُردو دیوان کو دہلی کے مطبع احمدی (شاہ درا) نے 29 جولائی 1861 کو شائع کیا۔

انقلاب 1857 کے ہنگامے کے دوران مرزا غالبؔ نے اپنی زندگی کے ایام کو کتابوں کے مطالعے میں گزارا۔ اس دوران مرزا غالبؔ نے اپنے ادبی مشغلے کو عروج بخشا۔ غدر کے ایام میں مرزا غالبؔ نے ''دستنبو'' (حالاتِ غدر کا روزنامچہ) لکھنے کے علاوہ محمد حسین برہان تبریزی کی مشہور فارسی لغت ''برہان قاطع'' کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا۔ مرزا غالبؔ کو اس لغت میں جہاں بھی کوئی فروگزاشت نظر آتی، یا جن الفاظ و معنی سے انھیں اختلاف یا اعتراض تھا، انھیں لغت کے حاشیے پر لکھ لیتے۔ جب 1857 کا غدر کمزور پڑا تو مرزا غالبؔ لغت پر لکھے حاشیوں کی مدد سے ''قاطع برہان'' نامی رسالہ بقول مرزا غالبؔ ''تیسری چوتھی نظر کے بعد کاتب سے صاف کرائی گئی تھی'' کا پہلا ایڈیشن مطبع نول کشور لکھنؤ سے 1862 میں شائع ہوا۔ دراصل مرزا غالبؔ نے اس لغت پر تین سال

یعنی 1857 سے 1860 تک کام کیا تھا۔ قاطع برہان کی اشاعت کے بعد علمی و ادبی حلقوں میں ہنگامہ برپا ہوا۔ ہنگامۂ کلکتہ کے بعد مرزا غالبؔ کی زندگی میں یہ دوسرا ادبی ہنگامہ تھا جس نے تاعمر غالبؔ کی زندگی کو متاثر کیا۔ قاطع برہان پر ملک کے مختلف مقامات سے اعتراضات کتابی شکل میں شائع ہونے لگے۔ یہاں تک کہ جب مرزا غالبؔ نے اس کتاب کو اپنے خط کے ساتھ ٹی۔ ایچ ٹھارنٹن معتمد برائے حکومت پنجاب کو سرکاری کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ کے نصاب میں شامل کرنے کے واسطے بھجوایا تو اس وقت کے ماہرین تعلیم بالخصوص کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور علمدار حسین پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور نے مرزا غالبؔ کی اس تالیف کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ انگریز حکومت کو یہ مشورہ بھی دیا کہ ''مولف نے قاطع برہان پر جو اعتراضات لگائے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں''۔ اس ادبی اور علمی ہنگامے کے بعد مرزا غالبؔ نے اس کا دوسرا ایڈیشن ''درفش کاویانی'' کے نام سے شائع کیا۔ قاطع برہان کے علمی و ادبی جھگڑے پر ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی آرا کو پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

''غالب کی ''قاطع برہان'' پر جو دُھم علمی حلقوں میں مچا اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ''برہان قاطع'' ایک مستند لغت کے طور پر گزشتہ دو سو سال سے ہندوستان و ایران میں استعمال ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ غالبؔ نے استہزا کے ساتھ جو اعتراض برہان قاطع اور اس کے مصنف محمد حسین برہان تبریزی پر کیے تھے، ان کا اندازِ بیان نامناسب تھا۔ تیسرے یہ کہ غالب نے زیادہ تر اپنی ہی رائے پر تکیہ کیا تھا۔ قدیم لغات ان کے سامنے نہیں تھے اور انھوں نے قیاساً لکھ دیا تھا کہ ''برہان'' کے لغات کسی اور کتاب میں نہیں ملتے جس کا جواب ''برہان قاطع'' کے حامیوں نے دیا اور اس قیاس کو بے بنیاد بتا کر غلط ثابت کیا۔ دراصل لغت نویسی غالب کا کام نہیں تھا۔''

(رسالہ دریافت، مدیر اعلا بریگیڈیئر عزیز احمد خان ریکٹر، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، جون 2002، صفحہ 12 تا 13)

مرزا غالب کی قاطع برہان کے جواب میں ہندوستان میں جو کتابیں یا رسالے منظر عام پر آئے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

(1) محرق قاطع برہان (فارسی) از سید سعادت علی، مطبوعہ احمدی، شاہدرہ، 1280ھ/1864

(2) ساطع برہان (فارسی) از رحیم بیگ رحیم میرٹھی، مطبع ہاشمی، میرٹھ 1283ھ

(3) قاطع القاطع (فارسی) از امین الدین دہلوی، مطبع مصطفائی دہلی 1283ھ

(4) مؤید برہان (فارسی) از آغا احمد علی احمد، مطبع مظہر العجائب کلکتہ 1282ھ

(5) ہنگامۂ دل آشوب (فارسی) مطبوعہ آرہ 5 ذالحجہ 1283ھ

(6) تیغ تبریزی (فارسی) مطبوعہ مطبع نبوی، کلکتہ 1284ھ

(7) ہنگامۂ دل آشوب (حصہ دوم) مطبع منشی سنت پرشاد، آرہ 1867

(8) شمشیر تیز تراز آغا احمد، مطبع نبوی، کلکتہ 1868

مذکورہ بالا فہرست کے مطابق ''قاطع برہان'' کے منظر عام پر آنے کے بعد میرٹھ کے مرزا رحیم بیگ میرٹھی نے ''ساطع برہان'' (فارسی) کے نام سے 108 صفحات پر مشتمل ایک کتاب 1283ھ مطابق 1865 میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع کی جس میں مرزا غالبؔ کے اعتراضات کا مدلل اور معقول جواب تلخ اور طنز آمیز انداز میں دیا گیا۔ مرزا غالبؔ نے ساطع برہان کا مطالعہ کرنے کے بعد عبدالرزاق شاکرؔ اور میاں داد خاں سیاحؔ کے نام خطوط ارسال کیے۔ ان خطوط میں مرزا رحیم بیگ کو مرزا غالبؔ نے زہر ناکی اور تلخی کے ساتھ تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنایا۔ مرزا غالبؔ نے میاں داد خاں سیاحؔ کے نام دوشنبہ 11 ستمبر 1865 کو اس بابت خط تحریر کیا۔ لکھا:

''وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملائے مکتب دار کا خبط ہے، رحیم بیگ اُس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اُس کی تحریر میں نے دیکھی، تم کو بھی بھیجوں گا۔ مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اُس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو ''لطائفِ غیبی'' میں رد کر چکے ہو، بہ ہر حال اُس کے جواب کی فکر نہ کرنا۔ والسلام والاکرام۔''

(غالب کے خطوط، جلد دوم،، 2006، صفحہ 565)

مرزا غالب نے مولوی محمد عبدالرزاق شاکرؔ کے نام اکتوبر، دسمبر 1865 میں ایک خط تحریر کیا۔ اس خط میں میں مرزا غالبؔ نے مرزا رحیم بیگ کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے بارے میں طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے سوالیہ نشان قائم کیے۔ یہاں تک کہ مرزا رحیم بیگ کے استاد امام بخش صہبائی کی عالمانہ صلاحیتوں پر بھی انگشت زنی کی۔ یہاں تک کہ مرزا غالبؔ نے مرزا رحیم بیگ کو امام بخش صہبائی کا شاگرد ماننے سے بھی انکار کیا۔ اس خط کو تحریر کرنے سے قبل مرزا غالبؔ، مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے نام بھی ایک خط تحریر کر چکے تھے، جو ادبی دنیا میں ''نامۂ غالبؔ'' کے نام سے مشہور ہوا تھا۔ مولوی شاکرؔ کو مرزا غالب نے ساطع برہان کے تعلق سے لکھا:

''نامۂ غالبؔ کا مکتوب الیہ رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے، عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے، بل کہ اُس کے ہم وطن ایسا کہتے ہیں کہ وہ قوتِ علمی بھی نہیں رکھتا، اوروں سے مدد لیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اُس کو تلمیذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اُن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اُس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجبِ عزّ و وقار ہو۔ رسالہ اُس کا ''ساطعِ برہان'' دلّی پہنچ کر ڈھونڈوں گا، اگر مل گیا تو خدمت میں پہنچے گا۔''

(غالب کے خطوط، جلد دوم،، 2006، صفحہ 838)

مرزا غالبؔ اور مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے اس ادبی معرکے پر محمد مشتاق شارقؔ نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''جہاں تک نامۂ غالبؔ کے انداز نگارش کا تعلق ہے بقول مرزا محمد عسکری ''اس میں وہ چٹکیاں لی ہیں کہ اول سے آخر تک پورا خط خارزار معلوم ہوتا ہے۔'' (بحوالہ ادبی خطوط غالب) صرف القاب ہی سے اندازہ لگائیے کہ اسے پڑھ کر رحیم بیگ پر کیا گزری ہوگی، غالب لکھتے ہیں کہ ''بخدمت مشفقی مکرم مرزا رحیم بیگ صاحب نورالہ، قبلہ، بالاسرار عینہ بالانوار'' بہر حال مقصود اس تمام بحث سے یہ ہے کہ خاک میرٹھ نے ایک

ایسی ہستی کو بھی جنم دیا جس نے غالبؔ کو نہ صرف عقیدت کی نظر سے دیکھا بلکہ غالبؔ کے محاسن و معائب کو نقد کی کسوٹی پر پرکھا بھی۔''

(میرٹھ کی ادبی خدمات، محمد مشتاق شارقؔ، کوٹلہ گھنٹہ گھر، میرٹھ 2014، صفحہ 121)

مرزا غالبؔ کا یہ نامۂ غالب سب سے پہلے دہلی میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں لکھنؤ کے اودھ اخبار میں 10 و 12 اکتوبر 1865 کی اشاعتوں میں اسے شامل کیا گیا۔ اس کے بعد منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے اسے عود ہندی میں شامل کیا۔ غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم نے اسے جلد چہارم میں صفحہ 1474 تا 1488 شامل کیا ہے۔ اس خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا رحیم بیگ کے لیے مرزا غالبؔ نے طرح طرح کے توہین آمیز الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس خط کے اہم نکات کو اگر یہاں پیش نہ کیا گیا تو بات ادھوری رہ جائے گی۔ مرزا رحیم بیگ کو لکھے گئے خط کی روشنی میں مرزا غالبؔ کی فارسی دانی اور لغات کے سلسلے میں ان کے خیالات اور ذاتی تجربات پر بھی بحث کے نئے نکات نکلتے ہیں۔ ویسے مرزا غالبؔ نے اس خط میں ایک جگہ اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ''آویزہ وافسوس کے بیان میں مجھ سے سہو ہوا ہے، مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد شرمسار ہے۔'' جب مرزا غالبؔ نے اپنی غلطی کو تحریری طور پر تسلیم کر لیا تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مرزا رحیم بیگ میرٹھی کے قاطع برہان پر کیے گئے اعتراضات صحیح تھے۔ اب میں نامۂ غالب سے چند اقتباسات (مشمولہ غالب کے خطوط جلد چہارم، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، اشاعت 2011) پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں، جس میں مرزا رحیم بیگ کی شخصیت اور علمیت کو مجروح کیا گیا ہے:

''احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا۔ اُن کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے اُستاد کا نہ لکھا۔ اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بقول غالبؔ با کدام خرس در جُوال شدہ ام'' بہم کیے، یا اور دو چار جگہ کلمۂ توہین رقم کیے، میں نے اپنے لطفِ طبع اور حسنِ عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دل نشیں کیا کہ حضرت نے محمد حسین دکنی، جامع برہان کو موافق میرے قول کے خرس یقین کیا۔'' (صفحہ 1474)

''جناب مرزا صاحب! کیا تم نہیں جانتے، کیوں کر نہیں جانتے، بے شبہہ جانتے ہو گے کہ اکابرِ اُمّت کو اُمورِ دینی میں کیا کیا مُنازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دِگر پہنچی ہے۔'' (صفحہ 1475)

''زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ، اور یہ عطیۂ خاص مِن جانب اللہ ہے۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے، مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گوار معنی یاب ہیں، لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعویِ زبان دانی کے باب ہیں۔''

(صفحہ 1477)

''ایک لطیفہ لکھتا ہوں، اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں، یہ سب کتابیں اور یہ سب جامع مانندِ پیاز ہیں تو بہ تو اور لباس در لباس، وہم در وہم اور قیاس در قیاس، پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے چلے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی نظر آئیں گے ۔معنی موہوم۔'' (صفحہ 1477)

''سچ ہے غالبؔ آگندہ گوش ہے، کسی کی نہیں سنتا۔ اسی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے موافق بہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے ''قاطع برہان'' و ''دافعِ ہذیان'' و ''لطائفِ غیبی'' کو ہرگز نہیں دیکھا۔ ''آویزہ افسوس'' کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اُس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے، جو کچھ اُس مصنف نے اس باب میں لکھا وہ قولِ فیصل اور کافی ہے، مانیں یا نہ مانیں، ناظرین کو اختیار ہے۔''

(صفحہ 1478)

''یہ جو آپ نے مولوی امام بخش کو امام المحققین خطاب دیا ہے، کتنے محققین نے ان کو اپنا امام مان لیا ہے؟ جب تک نہ اجماع محققین کا ہوگا، یہ خطاب بااجماعِ اہلِ عقل ناجائز و ناروا ہوگا۔'' (صفحہ 1481)

''مجھے تم پر ہنسی آتی ہے۔ بعض بات سمجھی نہیں جاتی ہے۔ خاقانی روح کو آبدست دِہ مجاورانِ حرم'' کہتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ خاقانی ''دست آب دِہ'' اسم پیمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہتا ہے۔ مولوی امام بخش نے تم کو بہت کچھ پڑھایا مگر طریقۂ استنباطِ معنی نہ بتایا۔ میرے حق میں جو کہتے ہو، خود بھی نہیں سمجھتے کہ کیا کہتے ہو۔'' (صفحہ 1486)

''میں اب قطعِ کلام کرتا ہوں، اور آپ کو بکمالِ تعظیم سلام کرتا ہوں پیمبری کی تحقیر کو مسلم رکھتے ہو، تم جانو اور سید ابرار، خاقانی پر بہتان کرتے ہو، تم جانو، اور وہ میدانِ معنی کا شہسوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے اگر چہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ، مجھ کو عرصۂ محشر میں اُس کی باز خواست نہیں:

زیمنِ عشق بکو نین صُلح کُل کر دیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

(صفحہ 1488)

(خط بنام مرزا رحیم بیگ، غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، جلد چہارم، صفحہ 1474 تا 1488)

مرزا غالبؔ نے سید احمد فرقانی وساکی و باکی میرٹھی (1836-1883) سے بھی برہان قاطع کے لفظ ''آواز گشتن'' کے سلسلے میں خط و کتابت کی تھی۔ فرقانی میرٹھی 1862 سے 1868 تک دہلی میں مقیم رہے۔ اسی درمیان فرقانی میرٹھی کے ادبی مراسم مرزا غالبؔ سے ہوئے۔ فرقانی میرٹھی کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ اس زمانے میں غالبؔ شعر گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔ لیکن ادبی ذوق و شوق ہنوز برقرار تھا۔ لیکن فرقانی میرٹھی کے قصیدے:

شد وقت کہ در طرّۂ سنبل شکن افتد
با غرّہ گل لالہ چو در مقترن افتد

کو سن کر مرزا غالبؔ نے فرقانی میرٹھی کی پیشانی کو کھڑے ہو کر چوما اور شرکائے مجلس سے مخاطب ہو کر کہا:

''غالب زندہ سید احمد حسین ہیں اسد اللہ غالب مردہ۔ سب لوگوں کو ان سے استفادہ کرنا چاہیے۔ میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں اور اثنائے داد میں یہ بھی فرمایا کہ گل کے ساتھ غزہ لفظ کم از کم تین دن کی تلاش میں ملا ہوگا۔''

(علامہ سید احمد حسن فرقانی وشاکی از سید علی جواد زیدی مطبوعہ نیا دور جنوری 1956، صفحہ 71)

برہان قاطع کے حوالے سے جو خط مرزا غالب نے فرقانی میرٹھی کو 1866 میں تحریر کیا اس میں فارسی الفاظ کے وزن پر مباحثہ ہے۔ دراصل یہ خط مرزا غالب نے مرزا رحیم بیگ کی کتاب ساطع برہان میں لفظوں پر کی گئی گرفت کے تعلق سے تحریر کیا تھا۔ مرزا غالب فرقانی میرٹھی کے استفسار کو رفع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واقعی فخر گرگانی نے لکھا ہے اور اُس کا قول سند مکمل ہے۔ لیکن یہ معلوم رہے کہ متقدمین از راہِ تحکم وزبردستی بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ متاخرین نے ترک کر دیا ہے، جیسے میر و مرزا ''لہو'' کو ''لوہو'' اور طرف کے مرادف ''اُور'' بہ وزن ''شور'' لکھتے تھے، متاخرین نے ترک کر دیا۔

بھائی! میں کیا کہوں، یہ بزرگ وار کیا کیا کچھ کہہ گئے ہیں۔ ماقبل شین مصدری مکسور ہوتا ہے ''نازش'' و ''سازش'' اور اس کے نظائر بہت ہیں۔ خاقانی کے ہاں ''کاہش'' حاصل بالمصدر ''کاستن'' کا اور ''نگاہش'' ضمیر کے شین کے ساتھ قافیہ کیا ہے۔ نہ ایک جگہ بلکہ سو جگہ، نہ ایک خاقانی نے بلکہ بہت اساتذہ نے۔

بھلا، میں تم سے پوچھتا ہوں ''آب کجا''، ''شراب کجا'' کے ساتھ ''تابہ کجا'' کا قافیہ جائز رکھو گے؟ یقین ہے کہ نہ رکھو گے۔ اب ہم نہ حافظ پر اعتراض کریں گے، نہ اس امر خاص میں تتبع کر سکتے ہیں، قصہ مختصر، میں نے مانا ''قاطع القاطع'' نے دو سو فاقوں میں ایک اعتراض رفع کیا۔ آگے کیا کرے گا؟ اور رفعِ اعتراض اس طرح کہ سوائے ایک شخص کے دوسرے کے کلام سے سند نہ ملے۔''

(غالب کے خطوط، جلد دوم،، 2006، صفحہ 730)

میرٹھ میں مرزا غالب کے پرستاروں اور عقیدت مندوں کی خاصی تعداد موجود تھی، ان مداحین کی زبانوں پر ہر آن غالب کے اشعار چڑھے رہتے تھے۔ ان پرستاروں کا اپنا علاحدہ حلقۂ ادب تھا۔ غالب کے اشعار کی اولین شرح کا سہرا بھی سرزمین میرٹھ کے سر بندھا ہے۔ کلام غالب کی شرح کو عام اور سادہ لفظوں میں مولانا احمد حسن شوکت میرٹھی نے پیش کیا۔ مولانا شوکت میرٹھی نے کلام غالب کے 700 اشعار کی شرح لکھی۔ شارحین کلام غالب کی فہرست میں مولانا شوکت میرٹھی کا نام سرفہرست ہے۔ سید محمد مرتضیٰ بیاں وزدانی میرٹھی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''دریں ولا ایک مدّت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلات کلام غالب کی دھوم مچی ہے اور بیشتر مغرورین اور متحصلین اشعار کے معنی پوچھتے پھرتے ہیں۔ خود ہم کو اپنے عزیز وقت صرف کرنے کا اکثر نقصان اُٹھانا پڑتا ہے نیز دیگر اہل دعویٰ کے بتائے ہوئے (یعنی شوکت میرٹھی کے بتائے ہوئے) معانی غیر واقعہ کا تذکرہ بھی ہم تک پہنچا ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ ہم لسان الملک میں تھوڑی سی جگہ بقدر امکان مصلحت شرح غالب کی نذر کیا کریں۔''

(ماہ نامہ لسان الملک بابت دسمبر 1895، جلد 9، مشمولہ میرٹھ کی ادبی خدمات، محمد مشتاق شارق ناشر ایس۔ ایم اخلاق، کوٹلہ گھنٹہ گھر، میرٹھ، 2014، صفحہ 155)

مولانا شوکت میرٹھی نے کلام غالب کے علاوہ متنبی، حماسہ، خاقانی، بیدل اور فرخی کے کلام کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔ شروع میں مولانا شوکت میرٹھی نے کلام غالب کے معنی، مطالب اور مفہوم کو اپنے رسالہ ''پروانہ'' میں شائع کیا۔ لیکن اہل علم و ذوق کے اصرار پر اسے 1337 ہجری میں اپنے مطبع شوکت المطابع سے کتابی شکل میں پیش کیا۔

سرزمینِ میرٹھ میں مرزا غالب کے خطوط کے پہلے مجموعے ''عود ہندی'' جو 10 رجب 1285ھ مطابق 27 اکتوبر 1868 کو مرزا غالب کی وفات سے چار ماہ پہلے مطبع مجتبائی میرٹھ سے، منشی ممتاز علی خاں کی کاوشوں سے شائع ہونے کا شرف حاصل ہے۔ منشی ممتاز علی خاں سے قبل چودھری عبدالغفور سرور غالب کے خطوط کو یکجا کر بقول ڈاکٹر خلیق انجم 1861 یا 1862 میں ''مہر غالب'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ لیکن منشی ممتاز علی خاں نے سرور کے مجموعۂ خطوط میں دیگر لوگوں کے خطوط کو شامل کرتے ہوئے اسے ''عود ہندی'' کے نام سے شائع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے خطوط کے مقدمے میں ''عود ہندی'' کی اشاعت، منشی ممتاز علی خاں کی کاوشوں، اس مجموعے میں شامل خطوط کی تعداد اور خود مرزا غالب کی اس مجموعے کے منظر عام پر آنے کے لیے بے قراری اور استفسار پر تفصیل کے ساتھ ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے لکھا:

''غلام غوث بے خبر، غالب سے اجازت لے کر اُن کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ غالب نے نہ صرف بہ خوشی اجازت دی بلکہ خود بھی خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔ بے خبر نے خطوط جمع کرنے کا کام 1861 میں شروع کیا تھا لیکن 1865 تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے تو بے خبر نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔ منشی صاحب نے ''مہر غالب'' اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام عودِ ہندی رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔ مجموعے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل کی ابتدا چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے سے ہوتی ہے۔ اور پھر وہ 31 خط ہیں جو سرور نے مرتب کیے تھے۔ دوسری فصل میں حسب ذیل حضرات کے نام خطوط ہیں: صاحب عالم مارہروی (2 خط) انور الدولہ شفق (20 خط) مرزا یوسف علی خاں عزیز (2 خط) مرزا ہرگوپال تفتہ (1 خط) مرزا حاتم علی مہر (18 خط) غلام غوث خاں بے خبر (25 خط) عبدالغفور نساخ (1 خط) ظہیر الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام (1 خط) نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے نام (1 خط) مردان علی خاں رعنا (2 خط) مرزا رحیم بیگ (1 خط) عبدالرزاق شاکر (10 خط) قاضی عبدالجمیل جنونی بریلوی (17 خط) مولوی عزیز الدین (1 خط) سید محمد عباس (1 خط) منشی غلام بسم اللہ (1 خط) مجروح (31 خط) میر سرفراز حسین (1 خط)۔''

(غالب کے خطوط، مرتب ڈاکٹر خلیق انجم، 2011، صفحہ 25 تا 26)

غالب کے خطوط کے اس مجموعے میں ممتاز علی خاں کے دیباچہ کے علاوہ آخر میں حکیم مولا بخش قلق میرٹھی کی تقریظ شامل ہے۔ قلق میرٹھی نے اس تقریظ کی ابتدا رباعی لکھ

کرکی۔ پوری تقریظ میں 2 رباعی، 2 مثنوی اور 2 شعر شامل ہیں۔ قلق میرٹھی کی آسان اور سلیس نثر نگاری کے جلوے اس تقریظ میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کردوں کہ مرزا غالب نے حکیم مولا بخش قلق میرٹھی سے اپنی فرمایش پر لکھوایا تھا۔ جب کہ قلق میرٹھی حکیم مومن خاں مومن کے تلامذۂ خاص تھے۔ قلق میرٹھی کے انگریزی نظموں کے اُردو تراجم ''جواہر منظوم'' اشاعت 1867 پر نظر ثانی ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم کے استفسار پر مرزا غالب نے کی تھی۔ قلق میرٹھی کے یہ انگریزی تراجم بعد کی نسل کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ میں اس موقع پر ''عود ہندی'' کے لیے لکھی گئی قلق میرٹھی کی تقریظ سے ایک مثنوی اور ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں؛ تاکہ قارئین خود اندازہ لگا سکیں کہ مرزا غالب کے کلام کے ساتھ ساتھ باشندگانِ میرٹھ کے علاوہ شعرا و ادبا مرزا غالب سے والہانہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ عود ہندی پر لکھی گئی تقریظ سے قلق میرٹھی کی مثنوی ملاحظہ کیجیے:

لکھے کیا کوئی فکر اوج غالب — بیاں سے دور حرف ذکر غالب
سخن دانی اگر ہوئے کوئی دیں — تو ایماں سب کا ہو غالب کا آئیں
عجب انداز نکتہ پروری ہے — کہ ہر نقطہ کتاب دائری ہے
اگر روشن بیانی وہ دکھائے — تو مہر و مہہ کو نظروں سے گرائے
سواد قدس، شکل نامہ اُس کی — قم عیسیٰ، صریر خامہ اُس کی
طبیعت کا جو پائے اُس کی انداز — نزاکت کو ہو کیا کیسا ناز و ناز
جو زہر خندہ اُس کے لب پہ جا پائے — تو قیس درد نوش جان بن جائے
اگر یہ خود سری کا مدعی ہو — تو دریا تک سے عاد قطر گی ہو
نہیں اس کا سخن میں کوئی ہم دوش — کہ اک حرف اُس کا اور معنی صد آغوش
سخن کا مجملاً ہو اُس کے کیا ذکر — ہر اک نقطہ ہے جس کا محشر فکر

(اُردو کا کلاسیکی ادب، کلیات قلق، مرتب کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول، دسمبر 1966 صفحہ 904)

قلق میرٹھی نے اپنی تقریظ کے آخر میں مرزا غالب کی دل کو چھو لینے والی نثر نگاری پر اظہارِ خیال پیش کرتے ہوئے لکھا:

''مآل ہرزہ درانی و آشفتہ نوائی قلق ناسنجیدہ بیان، کج مج زبان کا یہ کہ اس ستودہ کیش قدر اندیش نے کس عمدہ عنوان سے فضیلۂ طبیعت مرزا غالب یعنی خطوط ہائے پریشاں اُردو زبان کو روحِ رواں اور مغز جاں بنا دیا اور کس عبارتِ بے سر و پا سے کیسا باغستان معنی کھلا دیا۔ حق یہ ہے کہ ایسی سعی مشکور و محنت دراز و دور کون کسی کے لیے کرتا ہے۔ ہر ایک اپنی جیب و گریبان کو گلہائے مقصود سے بھرتا ہے۔ یہ آپ ہی کا کام ہے اس کا نام رابطہ خاص اور اخلاقِ عام ہے۔ جب طالبانِ زبان اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیں گے تو دلّی کا روزمرہ اُردو اور محاورۂ گفتگو گھر بیٹھے سیکھ جائیں گے۔

بارک اللہ! کیا بے ساختہ عبارت ہے کہ نثر میں نظم کا مزہ آتا ہے اور ہر جملہ فقرۂ معشوق کو شرماتا ہے۔ مگر افسوس اہل مشرق کی جگت بندی نے بگاڑا کہ دلی سے زیادہ اُس کی زبان کو اُجاڑا۔ اب کس کس کو سمجھائیے۔ کافی دل و دماغ کہاں سوائے ازیں ان کو فہم، ہم کو فراغ کہاں۔ شعر:

ہائے دہلی کہ دشوار بیان دہلی
لٹ گئی ساتھ ہی دہلی کے زبان دہلی

(اُردو کا کلاسیکی ادب، کلیات قلق، مرتب کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول، دسمبر 1966 صفحہ 906 تا 907)

اس طرح مرزا غالب کی ذاتی زندگی اور ادبی زندگی میں خطۂ میرٹھ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے وسط کے بعد مرزا غالب نے اُردو نثر میں نئی روح پھونکی۔ ان کے خطوط کا پہلا مجموعہ ''عود ہندی'' ان کی زندگی میں شائع ہوا۔ ان کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ''اُردوئے معلیٰ'' ان کی وفات کے 19 دن بعد جواہر سنگھ جوہر کی کاوشوں سے مارچ 1869 میں منظرِ عام پر آیا۔ البتہ مرزا غالب کا کلام ان کی زندگی میں ہی پانچ مرتبہ شائع ہوا۔ پہلی بار 1841، دوسری بار 1847، تیسری بار 1861، چوتھی بار 1862، پانچویں بار 1863 میں۔ مرزا غالب کا اُردو دیوان جو 1861 میں شاہ درا، دہلی سے شائع ہوا، پہلے وہ میرٹھ سے ہی شائع ہونا تھا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر مرزا غالب نے اسے واپس منگوالیا۔ بہر حال! میرٹھ سے مرزا غالب کا ہمیشہ لگاؤ بنا رہا۔ اس کی ایک خاص وجہ ان کے پرستار اور مداح میرٹھ میں رہتے تھے۔ جو انھیں یہاں کی ادبی سرگرمیوں سے واقف کراتے رہتے تھے۔ مرزا غالب نے بھی میرٹھ کے علمی اور ادبی شعورِ نقد کی قدر کی۔ اس مضمون کو میں بیسویں صدی کے وسط سے قبل اور وسط کے بعد میرٹھ کے ادیبوں کی جانب سے مرزا غالب کی نثر اور شاعری پر تحریر کردہ کتابوں کے حوالوں کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔ سرزمین میرٹھ آنکھیں کھولنے والے اُردو ادب کے قد آور ادیب، ماہر لسانیات، محقق، ناقد، شاعر، مدیر اُردو لغت، ترقی اُردو بورڈ، کراچی، ڈاکٹر شوکت سبزواری (1973-1908) نے ''غالب فکر و فن'' شائع کردہ گل پاکستان انجمن ترقی اُردو، کراچی، 1961 لکھ کر صحیح معنوں میں مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر شوکت سبزواری ''فلسفۂ کلامِ غالب'' جیسی معرکۃ الاراکتاب تصنیف کر چکے تھے۔ یہ کتاب قومی کتب خانہ بریلی سے شائع ہوئی تھی۔ گزارشِ احوالِ واقعی کے آخر میں 3 مارچ 1946 کی تاریخ درج ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ''پیش کش'' کے تحت لکھا:

''میں اپنی اس ناچیز تصنیف کو عالی جناب معلّی القاب جناب سیٹھ گوپی ناتھ صاحب رئیس اعظم میرٹھ کے نام معنون کر رہا ہوں، جن کی رفعت فکر، بلندیٔ کردار اور میرے ادبی مشاغل سے غیر معمولی دل چسپی نے علم و ادب اور شعر و حکمت کی تاریک راہوں کو میرے لیے روشن کر دیا ہے۔

وہی ایک چیز ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

شوکت سبزواری''

(فلسفۂ کلام غالب قومی کتب خانہ بریلی، 1946، صفحہ 5)

☆☆☆


علی گڑھ میں

'آجکل' حاصل کریں

ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

فون: 08439184102

شاہد ماہلی

# مزارِ غالب کی بازیافت

**15** فروری 1869 کو دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت مرزا اسداللہ خان غالب کا بلّی ماران کے اس مکان میں انتقال ہوا، جس کے کچھ حصّے آج بھی محفوظ ہیں۔ جنازے کی نماز دہلی دروازے کے باہر ہوئی اور غالب کو اس قبرستان میں دفن کیا گیا، جسے بقول خواجہ حسن نظامی، باغیچی انارکلی کہا جاتا تھا اور جو غالب کے سسرال والوں کی ملکیت تھا۔ اس قبرستان میں غالب کے سسر نواب الٰہی بخش خاں معروف، مرزا علی بخش خاں رنجور، زین العابدین خاں عارف وغیرہ مدفون تھے۔ غالب کی وفات کے بعد ان کی بیوی اُمراؤ بیگم اور مرزا باقر علی خاں کامل بھی اس قبرستان میں دفن کیے گئے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اس قبرستان میں بقول غلام رسول مہر 23 قبریں تھیں، غالب کی قبر معمولی بنائی گئی تھی۔ اس پر چونے کا پلاسٹر تھا اور سرہانے سنگِ مرمر کی لوح نصب تھی۔

لوح پر میر مہدی مجروح کا درج ذیل قطعہ تاریخ کندہ تھا۔

یا حی یا قیوم
رشکِ عرفی وفخر طالب مرد    اسداللہ خاں غالب مرد
کل میں غم واندوہ میں باخاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا ''گنجِ معانی ہے تہ خاک،،
1285ھ

مرزا حیرت دہلوی نے ''چراغِ دہلی،، میں لکھا ہے کہ غالب کے کسی ہندو شاگرد نے اس احاطے کی پختہ چہار دیواری بنائی تھی۔

چوں کہ مزارِ غالب بہت معمولی انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس لیے ساٹھ پینسٹھ سال میں اس کی حالت بہت خستہ ہوگئی۔ شاد عارفی 1934 میں دہلی آئے تھے۔ ان کے قول کے مطابق مزارِ غالب بہت بری حالت میں تھا۔

مولانا محمد علی مرحوم نے غالب کا مقبرہ بنانے کی تحریک شروع کی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ بقول ایم۔ حبیب خاں چھ مہینے کی لگاتار کوششوں سے 677 روپے جمع ہو سکے۔ چندہ دینے والوں میں خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا محمد عسکری، ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو وغیرہ شامل تھے۔ جب مقبرہ بنانے کا کام شروع ہونے لگا۔ تو خاندانِ غالب کے کچھ لوگوں نے کہا کہ انھیں پسند نہیں ہے کہ غالب کا مقبرہ چندے سے بنایا جائے۔ مجبور ہو کر مولانا محمد علی نے لوحِ قبر دوسری تیار کرادی، جس پر وہی اشعار تھے جو پہلی لوح پر تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد خواجہ حسن نظامی مرحوم نے مزارِ غالب کی مرمت کا بیڑا اٹھایا لیکن انھیں بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ 1952 میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم ڈاکٹر سرشانتی سروپ بھٹناگر کو غالب کے مزار پر مقبرہ بنانے کا خیال آیا۔ ان حضرات نے غالب سوسائٹی نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کی تفصیل ایک مضمون کی شکل میں مالک رام صاحب نے لکھی تھی۔ یہ مضمون ماہنامہ ''آجکل، نئی دہلی کے مارچ 1958 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

غالب سوسائٹی: 1952 میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مرحوم ڈاکٹر سرشانتی سروپ بھٹناگر کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دلّی میں غالب یادگار تعمیر کی جائے جو اس اُردو اور فارسی کے عظیم الشان شاعر کے بھی شایانِ شان قرار دی جاسکے اور اس کے مداحوں اور نام لیواؤں کے لئے بھی باعث فخر ہو۔

تجویز یہ تھی کہ ایک ''غالب میموریل ہال،، بنایا جائے، جہاں وقتاً فوقتاً ادبی اجتماع اور مشاعرے منعقد ہوسکیں، بلکہ اگر کسی سماجی اور تہذیبی ادارے کو بھی ضرورت ہو تو اسے بھی اس کے استعمال کی اجازت دی جائے۔

اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ڈاکٹر بھٹناگر مرحوم نے اپنے ہم خیال دوستوں کا ایک جلسہ طلب کیا۔ یہ اجتماع 17 جنوری 1953 کو ہوا۔ اس میں درج ذیل حضرات موجود تھے۔

| | |
|---|---|
| ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر | سکریٹری وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند۔ دہلی |
| شنکر پرشاد صاحب | چیف کمشنر دہلی |
| ودیا شنکر صاحب | جوائنٹ سکریٹری وزارتِ دفاع حکومت ہند۔ دہلی |
| جناب جوش ملیح آبادی | مدیر ماہنامہ ''آج کل،، دہلی |
| کنور مہدر سنگھ بیدی | بیدی ہاؤسنگ کمشنر۔ دہلی |
| سید اشفاق حسین | ڈپٹی سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند۔ دہلی |
| جناب شیو راج بہادر | دہلی |
| حمیدہ سلطان صاحبہ | دہلی |

اس جلسے میں یہ فیصلہ ہوا کہ ضروری روپیہ جمع کیا جائے۔ جس میں مجوزہ ہال تعمیر ہوسکے۔ خرچ کا اندازہ ڈیڑھ دو لاکھ کا تھا چنانچہ تمام اراکین جلسہ نے اپنے اپنے حلقۂ احباب سے روپیہ جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ سید اشفاق حسین صاحب باتفاق رائے خزانچی مقرر ہوئے۔

K-302، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔110031
shahid_ meyar@hotmail,com    فون: 9811786836

کچھ دن کام اسی نہج پر ہوتا رہا۔ جو رقوم جمع ہوئیں ''غالب میموریل فنڈ،، کے حساب میں لائیڈز بینک نئی دہلی میں جمع ہوتی رہیں۔لیکن جلد ہی اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان تمام مسائل کو کسی منظّم ادارے کے سپرد کر دینا چاہئے اس لئے طے پایا کہ ''غالب سوسائٹی،، قائم کی جائے اور اسے باقاعدہ رجسٹرڈ کرالیا جائے چنانچہ اس کے قواعد وضوابط بنائے گئے،اور سوسائٹی کی تشکیل اور ان قواعد پر غور وخوص کرنے کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب سے 18 ستمبر 1953 کو جمع ہونے کی درخواست کی گئی۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، شنکر پرشاد، ودیا شنکر، بیگم ساجدہ سلطانہ صاحبہ آف پٹودی، نواب ذین یار جنگ بہادر، جوشؔ ملیح آبادی ، برج نارائن، شیوراج بہادر، سید اشفاق حسین صاحب وغیرہ۔

ان میں بیگم صاحبہ پٹودی، نواب زین یار جنگ بہادر اور جوشؔ ملیح آبادی اس جلسے میں نہیں آسکے تھے۔انھوں نے غیر حاضری کے لئے معذرت کی۔اور لکھ بھیجا کہ اجتماع میں جو فیصلہ ہوا سے ہم منظور کرتے ہیں اور مزید یہ کہ ہمیں اس سوسائٹی کا اساسی رُکن بننے میں کوئی عذر نہیں۔

''مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی یادگار کو دوامی شکل دینے کے مقصد سے ''غالبؔ سوسائٹی،، کے نام سے ایک ایسوسی ایشن بنائی جائے۔اس کے لئے فوری کاروائی کی جائے تاکہ غالبؔ کی قبر کی مرمت ہو سکے اور اس پر ایک موزوں عمارت بنائی جائے۔ مزید یہ کہ اس کی یاد میں ایک ہال تعمیر کیا جائے۔

اسی جلسے میں سید اشفاق حسین صاحب نے حاضرین کو مطلع کیا کہ لینڈ ڈیولپمنٹ آفیسر (land development officer) نے مجوزہ ہال تعمیر کرنے کے لئے بستی نظام الدین میں ایک زمین کا ٹکڑا مخصوص کر دیا ہے۔جوں ہی سوسائٹی کی رجسٹری ہو جاتی ہے اس جگہ کے حصول کے لئے باضابطہ درخواست دے دی جائے گی۔اس کے بعد سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کا حسب ذیل انتخاب ہوا:

صدر: ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر

سکریٹری: سید اشفاق حسین صاحب

خزانچی: جناب ودیا شنکر صاحب

اراکین مجلس: بیگم صاحبہ پٹودی ،ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، جناب شنکر پرشاد صاحب، نواب زین یار جنگ بہادر، جناب جوش ملیح آبادی، جناب شیو راج بہادر صاحب، جناب برج نارائن صاحب۔

لیکن ودیا شنکر خزانچی کا عہدہ سنبھال بھی نہیں سکے تھے کہ ان کا تبادلہ کلکٹر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے پالن پور (بمبئی) ہو گیا اس لئے اس کے بعد برج نارائن کو خزانچی بنایا گیا۔اب تک تمام وصول شدہ رقوم لائیڈز بینک نئی دہلی میں ''غالب میموریل فنڈ،، کے حساب میں جمع ہوتی رہی تھیں جب سوسائٹی کی باقاعدہ تشکیل ہو گئی۔تو حساب مذکور کا نام بھی یہی کر دیا گیا۔

نواب زین یار جنگ بہادر (حیدرآباد) ہندوستان کے مایہ ناز ماہر فنِ تعمیر (architect) تھے انھوں نے مجوزہ مقبرے اور ہال کے نقشے تیار کئے۔روپیہ کی فراہمی کا کام تو ہو ہی رہا تھا۔سوسائٹی کے سکریٹری کی درخواست پر پورن چند صاحب، ایگزیکیٹو انجینئر محکمہ تعمیرات ہند، نے کام کی دیکھ بھال اپنی نگرانی میں کرائی۔

فرم نے مجوزہ نقشے کے مطابق سنگِ مرمر کی تختیوں اور جالیوں وغیرہ کا کام اپنے کارخانے مکرانہ ہی میں کرایا۔انھوں نے جون 1954 میں یہ کام شروع کیا تھا اور سب چیزیں اکتوبر 1954 کے آخر تک تیار ہو گئی تھیں ٹھیکے کی رو سے انھیں یہ کام چوکھنڈی 10 نومبر 1954 تک مکمل کر دینا چاہئے تھا لیکن بوجہ یہ کام دسمبر 1954 میں ختم ہوا۔

افسوس کہ سوسائٹی کے سرگرم صدر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر کو اپنی مساعی کو پوری طرح بارآور دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔یکم جنوری 1955 کو اچانک ان کا انتقال ہو گیا۔اس پر 6 جنوری 1955 کو سوسائٹی کا ایک فوری جلسہ بلایا گیا' جس میں تعزیتی قرارداد کی منظوری کے علاوہ جناب شنکر پرشاد صاحب نئے صدر چنے گئے۔

سوسائٹی کا ارادہ تھا کہ غالبؔ کے نام پر ایک یادگار ہال تعمیر کیا جائے بلکہ شروع میں تجویز ہی یہ تھی۔چوں کہ روپیہ بہت کم جمع ہوا۔اس لئے مجوزین نے مقبرہ کی چوکھنڈی ہی پر قناعت کر لی۔ہال پر کم وبیش دو ڈھائی لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔لیکن سوسائٹی کی موجودہ مالی حالت اتنے کثیر اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی یا تو اس کے لئے مزید چندہ جمع ہو یا کوئی اور پبلک ادارہ اس کی ذمہ داری لے۔یہ بات قابل غور ہے کہ اس وقت تک جو کچھ جمع اور خرچ ہوا ہے۔اس میں حکومت سے ایک پائی نہیں لی گئی۔

غلام رسول مہر نے اطلاع دی ہے کہ ''احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا۔ جسے حاجی حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی (خازن غالب سوسائٹی) نے اپنی گرہ سے معتد بہ رقم دے کر خریدا اور غالبؔ سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ایک اور قطعہ زمین بیگم حکیم محمود واصل خان مرحوم (برادر کلاں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم) نے حکیم احمد خاں مرحوم کی سفارش پر عطا فرمایا ہے۔نواب ذوقدر جنگ حیدرآبادی بھی مزار کی تعمیر کے آرزومند تھے۔نواب ممدوح غالبؔ کے بھانجوں کی اولاد میں سے ہیں

غالب کا مقبرہ 1955 یا 1956 میں مکمل ہوا۔تعمیر مکمل ہونے کے بعد سے لے کر اب تک انجمن ترقی اردو دہلی شاخ ہر سال 15 فروری یعنی غالبؔ کی یومِ وفات کے موقع پر مزارِ غالب پر جلسہ منعقد کرتی ہے۔اب یہ جلسہ بڑے پیمانے پر ہر سال ہوتا ہے۔

1996 کے اوائل میں انگریزی کے ایک مشہور وممتاز صحافی جناب فیروز بخت احمد نے انگریزی کے کسی اخبار میں غالبؔ اور ذوقؔ کے مزاروں کی خستہ حالی کا ذکر کیا۔اردو والوں کی خوش نصیبی ہے کہ فیروز بخت کی یہ تحریر سپریم کورٹ کے مشہور ایڈوکیٹ ایم۔سی ۔مہتہ کی نظر سے گزری۔انھوں نے مفادِ عامہ کے تحت سپریم کورٹ میں دہلی میونسپل کارپوریشن اور آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے خلاف رٹ پٹیشن دائر کر دی۔عدالت نے 23 اکتوبر 1996 کو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا اور دہلی میونسپل کارپوریشن کو حکم دیا کہ وہ دیکھیں کہ کیا شکایت جائز ہے کہ مزارِ غالبؔ کے چاروں طرف بے انتہا گندگی ہے اور خوانچہ فروشوں نے مزار غالبؔ تک جانے کا راستہ روک رکھا ہے۔

عدالت نے کہا کہ 20 ستمبر 1996 کو مسٹر رنجیت کمار، مسٹر۔ایف ایس۔نریمان اور مسٹر بی۔وی سہریا نے مزارِ غالب کے علاقے کا دورہ کیا ان کا کہنا تھا کہ جو سڑکیں مزارِ غالبؔ اور درگاہ نظام الدین کی طرف جاتی ہیں ان پر جو خوانچہ فروش بیٹھے تھے ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔دہلی میونسپل کارپوریشن کے ایڈیشنل کمشنر جگموہن نے بھی عدالت میں حلف نامہ داخل کیا۔جس میں کہا گیا تھا کہ خوانچہ فروشوں کو سڑکوں پر سے ہٹا دیا گیا ہے۔

2010 میں آغا خاں فاؤنڈیشن نے مزارِ غالب کی مرمت کا کام سنبھالا فرش درست کیا۔چاردیواری کی تعمیر کی گئی پیڑ پودے لگائے گئے اور ایک مستقل چوکیدار مقرر ہوا۔

☆☆☆

ٹی آر رینا

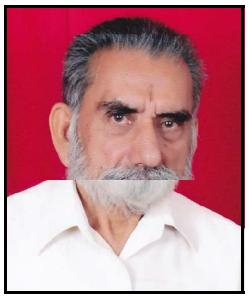

# غالب کی ترقی پسندی

**غالب** ہی نہیں ہمارے ادب کے بہت سے کلاسیکی شعرا سے متعلق آج کل یہ رجحان زور پکڑتا جارہا ہے کہ انہیں کسی نہ کسی صورت میں ترقی پسند رجحانات کا بنیاد گزار ثابت کیا جائے۔اس کے لیے ان کے کلام سے خاص خاص اشعار کا انتخاب کر کے اپنے علم و ذہنی ورزش کے ذریعے ایسی ایسی تاویلیں پیش کی جارہی ہیں جن سے یہ ثابت ہوجائے کہ یہی شاعر اصل میں ترقی پسند خیالات کا نقش اول ہے۔

اگر ادبی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے اور شعرا کے دواوین کو کھنگالا جائے تو ہمیں ایسے نتائج برآمد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعرا کی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل سے ترقی پسند ثابت ہوئی ہے۔

جس جدید نظم نگاری کے موجد ہم مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کو ٹھہراتے ہیں اور جنہوں نے لاہور میں اپنے قیام کے دوران ایسے مشاعروں کی بنیاد ڈالی جن میں شعرا کو عنوانات پر نظمیں لکھنے کی تلقین کی تو اس تحریک کے نشانات ہمیں دکن کے قلی قطب شاہ کے کلیات میں عام طور سے نظر آتے ہیں۔

چلئے دکن کی بات چھوڑیے، شمالی ہند کے اکبر آباد (آگرہ) کے نظیر اکبر آبادی کے مجموعۂ کلام کی ورق گردانی کیجئے۔ان کے کلام میں زیادہ تر موجود نظمیں عنوانات ہی پر تو لکھی گئی ہیں۔

اس شاعر سے بھی تھوڑا پیچھے چلئے۔جعفر زٹلی کے کلیات کو دیکھ لیجئے، جن کے کلام میں نظمیں ہی نظمیں نظر آئیں گی اور سب کی سب عنوانات پر ہی قلم بند کی گئی ہیں۔اس شاعر نے اورنگ زیب عالم گیر اور ان کے جانشینوں کا زمانہ پایا تھا۔انہوں نے اپنے کلیات کو ولی گجراتی کے دیوان کے شمالی ہند کی آمد سے بہت پہلے 1097ھ مطابق 1685ء میں مرتب کرلیا تھا۔ولی کا دیوان 1720ء میں دلّی پہنچا یعنی ولّی کی وفات 1707ء (اورنگ زیب عالم گیر کی وفات بھی اسی سال ہوئی تھی) کے 13 برس کے بعد، جب کہ جعفر اپنا کلیات ولّی کے دیوان کی آمد سے 35 برس پہلے مکمل کر چکا تھا۔یہ جو روایت آج تک مشہور چلی آرہی ہے کہ شمالی ہند میں ولّی گجراتی کے دیوان کی آمد سے شاعری میں غزل کا آغاز ہوا اسے جھٹلا دیا گیا ہے۔جعفر زٹلی اردو ادب کا پہلا شاعر ہے جو اپنی احتجاجی شاعری کی بدولت فرخ سیر (اورنگ زیب کے جانشین) کے حکم سے چمڑے کے تسمے سے گلا گھونٹ کر 1125ھ مطابق 1713ء میں ختم کر دیا گیا۔

(زٹل نامہ (کلیات جعفر زٹلی) مرتب: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو، نئی دہلی۔2003)

دوسرا ترقی پسند شاعر مولوی محمد باقر (مولانا محمد حسین آزاد کے والد) تھا جو حکومت وقت کے خلاف احتجاجی نعرہ بلند کرنے کی پاداش میں دہلی میں دار پر چڑھا دیا گیا۔دونوں کا یہ حشر دہلی ہی میں ہوا۔

جس ترقی پسند تحریک کا آغاز ہم اردو والے 1936 سے سجاد ظہیر کی رہنمائی میں مانتے ہیں، ان میں کتنے شعرا نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ 1960 تک آتے آتے جنہوں نے ترقی پسندی اور اشتراکیت کے نعرے بلند کیے تھے وہ بنگلوں اور لگژری گاڑیوں کے مالک بن بیٹھے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ان کی شامیں گزرنے لگیں۔ ہوائی جہازوں میں اے کلاس کا سفر ان کا معمول بن گیا۔طیاروں پر سوار ہوکر پوری دنیا گھوم لی۔اتنا ہی نہیں حکومت وقت کے اثاثے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے بدلتے دور کے ساتھ بدل جانا سیکھ لیا تھا۔

غالب نے بھی ایسا ہی کیا۔غالب کی پیدائش کے وقت انگریز ہندوستان کے کافی حصے پر قابض ہو چکے تھے۔اکبر آباد (آگرہ) سے غالب جب دہلی آئے تو اس وقت فصیل بند شہر کو چھوڑ کر باقی دہلی کے علاقوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔بہادر شاہ ظفر کے دادا شاہ عالم ثانی نے 1803 میں دہلی کی حکومت طشتری میں رکھ کر لارڈ لیک کے حوالے کر دی تھی۔ بغیر کسی مذمت کے اور حکومت کے معمولات سے فارغ ہوکر انگریزوں کے وظیفہ خوار بن بیٹھے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے تو وہی لال قلعہ اور فصیل بند دلّی کی حکمرانی ان کے پاس رہ گئی تھی۔

وہ ترک جن کے قدم ہمیشہ پابہ رکاب رہے اور ہاتھ میں تلوار، دوران سفر گھوڑوں کی پیٹھ پر اونگھ لیا کرتے تھے، ان کے جانشین کاسۂ گدائی تھامے انگریزوں کے تکبر کے سامنے سر جھکائے کھڑے نظر آتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کے دور تک آتے آتے انگریزوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے تھے کہ وہ قلعہ کی چار دیواری کے اندر تک مداخلت کرنے لگے تھے۔وہ اب یہ منصوبے بنا رہے تھے کہ کس طرح لال قلعہ پر قبضہ کیا جائے اور یہاں کے مکینوں کو نکال باہر کیا جائے۔

انگریزوں کی حریص نگاہوں و بد انتظامی کی پالیسیوں نے ملک کے مختلف مقامات پر ہندوستانی عوام کے دلوں میں نفرت و بغاوت کے بیج بو دیے تھے جو 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی صورت میں پھوٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ان کی چبھن ان کو ستانے لگی وہ جلد از جلد ترکوں کے آخری کانٹے کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے۔اس کے لیے انہوں نے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیے۔

قلعہ کے اندر انہوں نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں کا ایک جال سا پھیلا دیا تھا۔

الف۔237، لوئر ہری سنگھ نگر، رہاڑی کالونی، جموں۔180005 (جے اینڈ کے)
فون:09419828542 trrainaraina@yahoo.com

غداروں کے علاوہ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کی چہیتی بیگم زینت محل کو بھی اپنے فریب کے جال میں پھنسالیا تھا۔ بیگم زینت محل چاہتی تھی کہ ان کے شہزادے جواں بخت کو ولی عہد بنادیا جائے۔

بہادر شاہ ظفر کا شہزادہ مرزا فخرو بھی انگریزوں کے ساتھ مل چکا تھا اور ان سے ایک خفیہ معاہدہ بھی کر چکا تھا کہ شہر سے باہر اس کے لیے ایک کوٹھی تعمیر کردی جائے اور اس کے بدلے میں اس نے لال قلعہ ان کے حوالے کرنے کی دستاویز پر دستخط کردیے تھے۔ دستاویز کا مفہوم تھا کہ بادشاہ ظفر کے بعد جب اسے ولی عہد مقرر کیا جائے گا وہ لال قلعہ انگریزوں کے حوالے کردے گا۔ مگر مرزا فخرو کی بدقسمتی اور انگریزوں کی خواہش کے خلاف مرزا فخرو کا انتقال 10 جولائی 1856 کو شام کے سات بجے ہوا جس سے انگریزوں کے ناپاک ارادے مغلیہ حکومت کے خاتمے کے تھوڑی دیر کے لیے ٹل گئے۔

(بہادر شاہ ظفر، اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، اشاعت طبع دوم 2008 صفحہ 124)

اب بادشاہ ظفر اور بیگم زینت محل کی خواہش کے مطابق مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کی اس تحریک نے ان کے وقار کو مٹی میں ملادیا۔

غالب کو جب مغلیہ سلطنت کی تاریخ لکھنے پر بہادر شاہ ظفر نے معمور کیا تو مغلیہ حکومت کی تباہی و بربادی کی پوری داستان دستاویزی صورت میں غالب کے سامنے موجود تھی۔ 1739 میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تھا اور دہلی شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اٹھارہ سال بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کو فتح ہی نہیں کیا برباد بھی کردیا۔ ساتھ ہی مغلیہ حکومت کو اتنا کمزور کردیا کہ ایک افغان افسر حکمراں وقت پر مسلط کردیا۔

1857 میں پلاسی کی جنگ نے وقت کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ مغل صوبے دار خود مختار ہونا شروع ہوگئے۔ وسیع و عریض مغلیہ حکومت کا دائرہ سمٹنا شروع ہوگیا۔ ٹھیک 43 سال بعد لارڈ لیک اور ویلزلی نے مرہٹوں کو شکست دے کر شاہ عالم ثانی جو بہادر شاہ ظفر کے دادا اور اکبر شاہ ثانی کے والد تھے، کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور ان کی پنشن مقرر کردی۔ ان کی حالت بے بال و پر کے پرندے کی سی تھی جو کبھی اڑان نہیں بھر سکتا اور صرف صیاد کے رحم و کرم کا محتاج ہو کر رہ جاتا ہے۔

1806 میں شاہ عالم ثانی کا انتقال ہوا اور اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ ان کے عہد میں چارلس مٹکاف ریزیڈنٹ مقرر ہوا تو اس کی مداخلت قلعہ کے اندر بے روک ٹوک شروع ہوگئی۔ اس نے بادشاہ وقت کی تعظیم و توقیر کو بالائے طاق رکھ دیا۔ 28 ستمبر 1837 کو اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد 29 ستمبر 1837 کو بہادر شاہ ظفر مغلیہ تخت پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت ان کی عمر قریب 52 برس تھی۔ وہ پوتے پوتیوں والے ہو چکے تھے۔ ان کے کل 16 بیٹے اور 31 بیٹیاں تھیں۔ بہادر شاہ ظفر بھی اپنے دادا اور والد کی طرح انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔

غالب اکبر آباد سے جب دہلی وارد ہوئے تو اس وقت اکبر شاہ ثانی لال قلعہ کے تخت پر رونق افروز تھے۔ سیاسی طور پر دہلی بہت پہلے تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ مگر انگریزوں کے دور میں مذہبی اور تہذیبی طور پر دن بہ دن گراوٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انگریز جان بوجھ کر اپنی تہذیب کا سم قاتل یہاں کے عوام میں پھیلا رہے تھے۔ ہر شخص دھیرے دھیرے اس کے اثرات سے متاثر ہو رہا تھا۔ غالب پر بھی اس کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہو چکے تھے۔ وہ ولایتی شراب کے رسیا ہو چکے تھے۔ یہ بھی انگریزوں کے پنشن خوار اور ان کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ دوسرا ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔

مرزا الٰہی بخش کی صاحبزادی سے ان کا عقد ہو چکا تھا۔ ''ایک دوسرے الٰہی بخش بھی تھے جو بہادر شاہ ظفر کے سمدھی تھے جو بعد میں غدار ثابت ہوئے۔''

(انتخاب 'گگن' ماہنامہ بمبئی، جلد اول، صفحہ 357)

غالب کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے ''مرزا غالب نے اپنی بیوی امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے مرزا نواب زین العابدین عارف کو گود لے لیا تھا، عارف کے بڑے بیٹے باقر علی کامل ہی حمیدہ سلطان کے نانا تھے۔ حمیدہ سلطان کے والد آرمی میں سرجن ہونے کے بعد لفٹیننٹ کرنل ہوگئے تھے۔ ان کی جائیداد آسام میں تھی۔

(ایضاً صفحہ 357)

یہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ غالب اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ چاچا کے سایہ سے بھی جلد محرومی نصیب ہوئی، والدہ بھی چل بسیں۔ شادی کے بعد یکے بعد دیگرے سات بچے ہوئے، ایک بھی زندہ نہ بچا۔ ایک بھائی اور ایک لے پالک بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ زندگی میں کبھی عشرت نصیب نہ ہوئی۔ شہرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ زندگی نہایت ہی کسمپرسی میں گزری۔ تعلیم کا بھی کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہوا۔ غالب کو پیار کے لیے شہزادی نہیں ڈومنی نصیب ہوئی اور وہ بھی ان کی زندگی میں ہی آسمانی سفر اختیار کر گئی۔ کل ملا کر دنیاوی زندگی میں جو چیز ان کے حصے میں آئی وہ تھا ان کا غم۔ لیکن اس غم کو انہوں نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں سمیٹ لیا۔ یہاں کہیں بھی ان کا غم کلام میں سامنے آتا ہے تو وہ ایک درد مند دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ماننے کی ہے کہ وہ پیدائشی شاعر تھے اکتسابی نہیں۔ انہوں نے نوع انسانی کی پیروی ضرور کی۔ وہ فلسفی بھی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے کسی فلسفے کی اشاعت کی۔ وہ مذہبی بھی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے نماز روزے کی کبھی پابندی کی۔ ماہ رمضان میں شطرنج و جوا کھلانے کے جرم میں گرفتار ہونا ان کے لیے ننگ و عار نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی مجبوری کی خاطر انہیں رامپور، لکھنؤ اور کلکتے کا سفر کرنا پڑا۔ دہلی کی بدلتی ہوئی تہذیبی زندگی کو وہ دیکھ ہی رہے تھے، مگر کلکتے کے سفر کے دوران ان کے ذہنی دریچے اور وا ہوئے۔ وہ مغرب کی صنعتی و سائنسی ترقی سے خوب متاثر ہوئے۔

ان کے حق میں یہ بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے زمانے سے کہیں آگے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ روایت سے انحراف کیا۔ گو وہ سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن زمانے کی نبض کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے لیے ایک الگ راہ نکال لی تھی۔ اپنی اقتصادی بدحالی کو سدھارنے کے لیے انہوں نے خوشامد کا پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے نوابوں، انگریز افسروں اور بہادر شاہ ظفر کے قصیدے لکھنے میں عار نہیں سمجھا۔ خطوط میں بھی اس کے واضح ثبوت ملتے ہیں۔

غدر کے دوران انہوں نے 'دستنبو' کے نام سے ایک روزنامچہ لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کے بہت سے مندرجات حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ اس وقت یہ اپنی عمر کے باسٹھویں سال میں تھے۔ وہ خود رقم طراز ہیں:

''اس سال، اس کہن خاکدوں کی خاک اڑاتے، میرا باسٹھواں سال شروع ہوا ہے اور پچاس سال سے شیوۂ سخن کی مشق میں جان کھپا رہا ہوں۔''

(1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی، از مخمور سعیدی، نیشنل بک ٹرسٹ، پہلا ایڈیشن 2007، صفحہ 20)

1857 میں جب ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کا پرچم لہرایا تو غالب یوں گویا ہوا: ''ہندوستانیوں نے منصف (حاکموں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑا اور درندوں کی رفاقت کے جال میں پھنس گئے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ درمن و دام اور داد و دو میں کس قدر تفاوت ہے۔ انصاف یہ ہے کہ انگریزی آئین کے سوا، کسی اور آئین (کے تحت) امن و آرام کی امید رکھنا کور چشمی کے مترادف ہے۔'' (ایضاً، صفحہ 4)

غالب کی ذہنیت دیکھیے کہ انگریزوں سے قبل مغلیہ سلطنتوں کے دور میں کبھی امن و آرام رہا

ہی نہیں۔مغلیہ سلطنت کی بساط الٹتے دیکھ کر غالب نے بھی رنگ بدلنا شروع کر دیا۔

ہندوستانیوں کی تباہی کو غالب انگریزوں کی فتحیابی تصور کرتا ہے اور انہیں کسی قسم کی گزند پہنچانے کو خلاف قانون۔وہ لکھتا ہے:

''کتاب کا ناظر جان لے کہ میں، کہ قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھیرتا ہوں، بچپن سے انگریزی حکومت کا نمک خوار ہوں۔گویا جب میرے منہ میں دانت آئے ہیں میں نے ان فاتحین عالم کے خوان (کرم) روٹی پائی ہے۔سات آٹھ سال ہوتے ہیں کہ بادشاہ دہلی نے مجھے اپنے پاس بلوایا ہے اور چھ سو روپے سالانہ کے عوض تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھنے کی خواہش کی، جسے میں نے قبول کر لیا اور اس میں مصروف ہو گیا۔کچھ مدت بعد جب بادشاہ کے قدیم استاد کا انتقال ہو گیا، اصلاح سخن (کی ذمہ داری) بھی مجھ پر آ گئی۔پیرانہ سالی اور ضعیفی، پھر میں گوشہ گیری اور تن آسانی کا خوگر، اس سب پر مستزاد، اپنے ثقل سماعت کے سبب سے دوسروں کے دلوں کا بوجھ ہونا اور محفل میں جو شخص کوئی بات کہے، اس کے ہونٹوں کی طرف تکنا، ناچار، ہفتے میں ایک دو بار قلعے جاتا اور بادشاہ محل سے باہر آتا تو کچھ دیر خدمت میں کھڑا رہتا ورنہ دیوان خاص میں تھوڑی دیر بیٹھتا اور لوٹ آتا اور جتنا کچھ اس دوران میں لکھ لیا ہوتا، اپنے ساتھ لے جاتا یا کسی کے ہاتھ بھیج دیتا۔'' (ایضاً، صفحہ 6-5)

ہندوستانی فوج کے سپاہیوں نے جب انگریزی فوجی کمانڈروں کی مذہبی پالیسی کے خلاف احتجاج بلند کیا اور وہ میرٹھ سے دہلی چلے آئے۔بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے تو غالب 'دستنبو' میں یوں رقم طراز ہیں:

''صاف پوچھئے تو 1273ھ، 16 رمضان، پیر کے دن، دوپہر کے وقت مطابق 11 مئی 1857 اچانک قلعے کے در و دیوار اور دہلی کی فصیلیں لرز اٹھیں اور یہ زلزلہ چاروں طرف پھیل گیا۔بات بھونچال کی نہیں (دراصل) اس منحوس دن، میرٹھ کی کینہ خوردہ فوج کے چند بدبخت سرپھرے سپاہی شہر میں در آئے، سب کے سب بے شرم اور فسادی اور آقا کشی (کے جذبے) سے انگریزوں کے خون کے پیاسے، شہر کے دروازوں کے محافظوں نے جو ان کے ہم اصل اور ہم پیشہ ہونے کے سبب، عجب نہیں کہ پہلے ہی ان کے 'ہم قسم' بھی ہو گئے ہوں، نہ حق نمک کا پاس کیا نہ شہر کی حفاظت کا، اور ان بن بلائے یا بلائے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ان سرگران و سبک عناں سواروں اور تند خو تیز رفتار پیادوں نے، جب دروازوں کو کھلا اور دربانوں کو مہمان نواز پایا تو دیوانہ وار ہر طرف دوڑ پڑے اور جس کسی کو حکام میں دیکھا، جب تک اسے بری طرح مار نہ ڈالا اور جہاں کہیں ان بڑے لوگوں کی آرام گاہیں نظر پڑیں، جب تک انہیں جلا کر خاک نہ کر دیا۔اس طرف سے منہ نہیں موڑا۔ (ایضاً صفحہ 6)

مرزا غالب نے ہندوستانی سپاہیوں کو انگریز حاکموں کا قاتل اور ان کی آرام گاہوں کو جلانے کا مرتکب ٹھہرایا ہے۔لیکن اس سے قبل انگریز جو بربریت کر چکے تھے اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اس کا ذکر نہیں کیا۔غالب ہندوستانیوں کو جو آزادی کی پہلی جنگ لڑ رہے تھے انہیں نمک حرام اور نافرمان قرار دیتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''نمک حراموں نے بہانگ دہل نافرمانی کا شور مچایا۔''

(ایضاً صفحہ 8)

غالب نے 'دستنبو' میں کہیں بھی ہندوستانی سپاہیوں یا زمینداروں کے حق میں جو آزادی کی پہلی جنگ میں شریک تھے، ایک جملہ بھی تحریر نہیں کیا۔بلکہ انہیں ظالم، خونی، چور اچکا، چھچھورا اور خوب رو عورتوں کا عصمت ریز کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

غالب نے بادشاہ ظفر کو بھی نہیں بخشا جس کا وہ نمک کھاتا اور قصیدہ لکھتا تھا۔بہادر شاہ ظفر نے جب مجبوراً فوجوں کی سرپرستی قبول کی تو غالب طنزیہ انداز میں یوں تحریر کرتا ہے:

''بادشاہ کو فوجوں نے اپنے حلقے میں لے لیا اور یہ ایسا تھا جیسے چاند کو گہن لگ جاتا ہے۔چاند کو گہن کبھی نہیں لگتا، بجز پورے چاند کے، بادشاہ (اگرچہ) پورے چاند کی طرح نہیں تھا (لیکن) گہن لگے چاند سے مشابہ تھا۔''

(ایضاً صفحہ 11)

غالب نے اسی پر بس نہیں کیا۔جب انگریزوں نے توپوں کی مدد سے شہر کی فصیل توڑ ڈالی اور اندر گھس آنے کے بعد بربریت کا جو بازار گرم کیا تو انہوں نے ہندوستانیوں کو یوں مخاطب کیا۔''ان پانچ دن میں گم کردہ راہ کالے شہر کے اندر اور باہر سے خنزیروں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور ملک گیروں نے شہر اور قلعے پر مکمل قبضہ کر لیا۔''

(ایضاً، صفحہ 17)

غالب کو دہلی کلکٹری کے خزانے سے اپریل 1857 تک پنشن ملتی رہی۔ماہ مئی میں بند ہو گئی اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس نے بہادر شاہ ظفر کا سکہ کہا تھا۔کسی نامعلوم شاعر نے یوں کہا تھا:

بہ زر در سکہ، کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہ ثانی

لیکن غالب کا کیا ہوا سکہ یوں ہے:

برزر آفتاب ونقرۂ ماہ
سکہ زد در جہان بہادر شاہ

(19 جولائی 1857 خبروں کا خلاصہ، موصولہ از دہلی)

پنشن حاصل کرنے کی غرض سے غالب نے انگریز حاکموں کی خوشامد مزید تیز کر دی۔ان کے ظلم و تشدد اور بربریت پر لفظی ملمع چڑھانا شروع کر دیا اور اس حد تک مصلحت کوشی پر اتر آیا کہ اپنے پاگل بھائی کے قاتلوں کو بھی قاتل نہیں لکھا اور اس کی موت کی روداد یوں قلم بند کی:

''19 اکتوبر کو وہی پیر کا دن، جس کا نام ہفتے کے دنوں کی فہرست سے کاٹ دینا چاہئے، ایک سانس میں آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل گیا۔اس دن کے پہلے پہر میں، وہ افسردہ روز ولیدہ مودربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا..... پانچ دن تک تیز بخار میں جلتا رہا اور اس کے وقت بارہ بجے تو سن (عمر) کو اس تنگنائے کو دالے گیا، آب و آبچیں سے درگزر، غسال اور گور و کفن کو نہ ڈھونڈ، سنگ و خشت کا نہ پوچھ، چونے گارے کی بات نہ کر اور مجھے بتا کہ میں کیوں کر جاؤں (میت کو) کہاں لے جاؤں اور کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔بڑھیا سے بڑھیا کپڑے سے لے کر گھٹیا سے گھٹیا کپڑے تک بازار میں کچھ نہیں بکتا۔ہندو یہ کر سکتے ہیں کہ مردے کو دریا پر لے جائیں اور پانی کے کنارے سپرد آتش کر دیں۔مسلمانوں کی کیا مجال کہ دو تین ایک دوسرے کے ساتھ، کاندھے سے کاندھا ملا کر کسی راستے سے گزر جائیں، کہاں کے میت کو باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور سرانجام کار پر کمربستہ ہوئے۔پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک کو آگے آگے اور میرے نوکروں میں سے دو کو اپنے ساتھ لے کر گئے، مردے کو نہلایا، دو تین سفید چادروں میں جو یہاں سے لے کر گئے تھے، لپیٹا، ایک مسجد میں جو مکان کے پہلو میں تھی، زمین کھودی، مردے کو وہاں رکھا اور گڈھے کو مٹی سے پاٹ کر لوٹ آئے۔''

(1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی، مخمور سعیدی، صفحہ 28-27)

اس وقت شہر کے حالات اتنے خراب تھے کہ گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ پھر کون اس دیوانے کی لاش کو دفنانے گیا ہوگا۔ انگریزوں کی گولی کے نشانے کے بعد وہ کہاں پڑی سڑتی رہی ہوگی۔

غالب کی اس غلط روداد کی تصدیق مخمور سعیدی یوں کرتے ہیں:

''مرزا صاحب نے یہاں دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بھائی مرزا یوسف بخار میں مبتلا ہو کر فوت نہیں ہوئے تھے، گوروں کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔''

(ایضاً صفحہ x vii)

اسی طرح بہادر شاہ ظفر کے شہزادوں کے قتل سے متعلق بھی غالب نے تفصیل سے ذکر نہیں کیا، صرف ڈھائی سطروں میں بات ختم کردی اور انگریزوں کی بربریت ان کی تحریر میں دب کر رہ گئی:

''شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ بندوق کی گولی کا زخم کھا کر موت کے منہ میں چلے گئے اور کچھ کی روح پھانسی کی رسی کے پھندے میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ کچھ قید خانوں میں ہیں اور کچھ آوارۂ روئے زمین۔''

(ایضاً صفحہ (xvii)

یہاں میں اس بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ 21 ستمبر 1857 کو میجر ہڈسن نے بادشاہ ظفر، اس کی بیگم زینت محل اور شہزادہ جوان بخت کو مرزا الٰہی بخش اور مولوی رجب علی (یہ دونوں انگریزوں کے مخبر تھے) کی مدد سے ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر کے لال قلعہ لے آئے اور یہاں ایک تنگ و تاریک کمرے میں انہیں قید کر دیا۔

دوسرے دن ہڈسن پھر ہمایوں کے مقبرے پہنچا، کیونکہ مرزا الٰہی بخش اور رجب علی نے انہیں یہ خبر دی کہ تین شہزادے مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر وہاں موجود ہیں۔ مخبروں کی اطلاع پر ہڈسن نے تینوں شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے بلا شرط گرفتار کر لیا۔ ان تینوں کو ایک بیل گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ ہڈسن کا کہنا ہے کہ اس موقع پر ایک مسلح گروہ نے انہیں گھیر لیا تھا لیکن اس پر قابو پانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہڈسن جب شہزادوں کو گرفتار کر کے دہلی کی طرف بڑھا تو مجمع بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب یہ لوگ دہلی دروازے کے قریب پہنچے تو ہڈسن نے تینوں شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے اتار لیں۔ اس کے بعد ہڈسن نے خود اپنے ہاتھوں سے ان تینوں کو گولی ماردی۔'' (1857 کے غداروں کے خطوط، تالیف و تدوین، اشاعت سید عاشور کاظمی، انجمن ترقی اردو ہند) نئی دہلی، اشاعت 2011، صفحہ 84، ''بہادر شاہ ظفر از اسلم پرویز، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، اشاعت دوم 2008، صفحہ 131 و 354) اور لاشیں بیل گاڑی میں ڈال کر کوتوالی لے آیا اور وہاں پھینک دیں۔ یہاں کبھی اورنگ زیب نے گرو تیغ بہادر کا سر رکھا تھا۔

اس کے بعد باقی خاص نو شہزادوں اور بیس دوسرے شہزادوں کو کوتوالی کے سامنے (یہاں آج کل شیش گنج گرودوارہ ہے، چاندنی چوک کے قریب) لا کر ہڈسن نے انہیں گولیوں سے اڑانے اور پھانسی پر لٹکانے کا کام کیا۔ کئی دنوں تک یہ لاشیں یہاں پڑی سڑتی رہیں کوئی ان کو اٹھانے والا نہیں تھا۔

بلی ماران (یہاں غالب قیام پذیر تھے) سے کوتوالی کا فاصلہ زیادہ دور نہیں۔ اگر غالب گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے، جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، تو بھی انہوں نے شہزادوں کو گولی مارے جانے اور پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد ان کی لاشوں کو کئی دن تک یہاں پڑے سڑتے رہنے کا سنا تو ہوگا۔ مگر کہیں بھی انہوں نے ایک صفحہ تک ان واقعات سے متعلق سیاہ نہیں کیا۔

9 مارچ 1858 کو بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا۔ غداروں (مرزا الٰہی بخش، رجب علی، مکند لال اور حکیم احسن اللہ خاں) کے بیانات کی وجہ سے انہیں پھانسی کی سزا ہوئی۔ لیکن شاطر انگریز انہیں پھانسی دے کر ہیرو نہیں بنانا چاہتے تھے۔

7 اکتوبر 1858 کی شام چار بجے شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کو ہمیشہ کے لیے جلا وطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔

بادشاہ ظفر کے ساتھ رنگون میں ان کے ورثا میں نواب زینت محل بیگم اور ان کے دو بیٹے مرزا جواں بخت اور شاہ عباس تو تھے ہی لیکن ظفر کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کے ایک اور بیٹے مرزا کو چک سلطان کو بھی جو ایام 'غدر' سے لاپتہ تھے اور جے پور میں روپوش تھے، گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا تھا۔''

((بہادر شاہ ظفر، از اسلم پرویز، صفحہ 153، 167، 185)

غالب کی نثری تحریریں فارسی اور اردو خطوط ہیں۔ ان نامہ ہائے فارس ہوں یا پنج آہنگ مہر نیم روز ہو یا دستنبو، اردوئے معلیٰ ہو یا عود ہندی، غالب نے ان میں تفصیلاً ان واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ نثری تحریروں کے علاوہ شاعری میں بھی انہوں نے بغاوت نہیں کی بلکہ اس کے بدلے میں انہوں نے ان انگریز افسروں کے قصیدے لکھے، جنہوں نے فتح دہلی کے بعد وہ بربریت کی کہ تاریخ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ظلم و استبداد کو بھی بھول گئی۔

غالب نے یہ سب کچھ اپنی خاطر کیا۔ اس میں ان کا اپنا مطلب پوشیدہ تھا۔ وہ اپنی ضبط شدہ پنشن بحال کروانا چاہتے تھے۔ پنشن حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کلکتے تک کا سفر کیا۔ وہاں کے انگریز افسر کے لیے بھی قصیدہ لکھا، مگر لاحاصل، ان کی پنشن بحال نہیں ہوئی۔ ہاں کلکتے کے سفر سے انہیں ایک فائدہ ضرور ہوا کہ نئی سائنسی ترقی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس سے نئے خیالات ان کے ذہن میں ابھرے جن کا ذکر بعد میں ان کے بعض خطوط میں ملتا ہے۔

غالب کی خوشامد اور کاسۂ گدائی سے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے ''غالب کے خطوط'' کی جلد اول مرتب کرتے وقت قلم بند کی ہے۔

''وہ غالب، جو شاعری میں پوری کائنات سے مبارزہ طلب ہے اور ہر بڑی طاقت سے نبرد آزما ہے، خطوط میں اپنی معمولی ضرورتوں اور احتیاجوں کے حصار میں گرفتار نظر آتا ہے، وہ اہل ثروت کے سامنے کاسۂ گدائی لیے کھڑا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے دربار میں گڑگڑا کر دعائیں دے رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے ''خدا حضرت کو سلامت رکھے، مجھ سے اپاہج نکمے کو بعوض خدمت تنخواہ دیتے ہو'' اور کبھی عرض کرتا ہے ''مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے مگر حضور جو عطا فرمانا ہے جلد ارشاد ہو:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

شاعری میں خود بینی و خود داری کا یہ عظیم تصور پیش کرنے والا انسان انگریزوں کے ہندوستانی منشی کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ غلام غوث خاں بے خبر دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعر ہیں۔ چونکہ صوبہ غرب و شمال کے لیفٹیننٹ گورنر کے منشی ہیں، غالب انہیں لکھتے ہیں:

''اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے، ابداع اس کو کہتے ہیں، جدت طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایان ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروئے کار لائے۔ 10 جنوری 1866۔''

(غالب کے خطوط از ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، جلد اول، اشاعت تیسرا ایڈیشن 2000، صفحہ 141)

خوشامد کی ایک اور مثال ڈاکٹر خلیق انجم کی تحریر سے ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے غالب کے ایک اور خط سے پیش کی ہے:

''امیر خسرو کے علاوہ غالب ہندوستان کے کسی اور فارسی شاعر کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ایک شاگرد اور تیسرے درجے کے شاعر نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جوان غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سن لیجئے اور میرے درد دینے کی داد دیجئے۔ مولانا قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سر حد کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔'' (ایضاً صفحہ 142)

اپنی معمولی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے معمولی درجے کے شاعروں اور شاگردوں کے لیے اس قسم کی مبالغہ آرائی ظاہر کرتی ہے کہ غالب نے اپنے ضمیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مار دیا تھا اور خوشامد کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ غالب نے اپنے خاندان اور اپنے استاد سے متعلق بھی دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اپنی فارسی دانی سے متعلق بھی انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ 'دستنبو' سے متعلق منشی ہرگوپال تفتہ کو یوں لکھتے ہیں:

''میں نے آغاز یازدہم مئی 1857 سے یکم جولائی 1858 تک روداد شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ 'دساتیر' کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔''

پوری احتیاط کے باوجود عربی کے کچھ الفاظ 'دستنبو' میں شامل ہو گئے ہیں۔''

(غالب کے خطوط، ڈاکٹر خلیق انجم، جلد اول، صفحہ 282-145)

'دستنبو' سے متعلق نثار احمد فاروقی کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''غالب نے ایام غدر کا روزنامچہ 'دستنبو' کے نام سے لکھا، لیکن اس میں دو عیب ہیں۔ ایک اسلوب کا دوسرا مواد کی تاریخی حیثیت کا۔ اسلوب میں تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ چلو اپنی فارسی دانی کا لوہا بھی لگے ہاتھوں منواتے چلیں، جس پر انہیں ناز تھا، چنانچہ انہوں نے خالص فارسی بے آمیز عربی کے شوق میں اسلوب کو نامانوس اور ادق بنا دیا۔ حالانکہ دو در جن الفاظ عربی کے پھر بھی انہیں دھوکہ دے کر گھس آئے اور تاریخی مواد کا عیب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پنشن اور دربار کے ملیہ (عملہ) کو بچانے اور بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا سکہ کہنے کا داغ مٹانے کے لیے ہندوستانی تلنگوں کے مظالم بیان کیے مگر یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا۔''

(غالب بد دیانتی، از نثار احمد فاروقی، گگن، بمبئی، شمارہ نمبر 89، مشمولہ 'انتخاب گگن' جلد اول، صفحہ 542)

غالب کے خطوط اور بعض دوسری تحریروں میں ان کے خوشامدی ہونے کے ثبوت ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ شاعری میں بھی انہوں نے مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے۔

مخمور سعیدی نے اپنی کتاب ''1857 کی کہانی مرزا غالب کی زبانی'' کے صفحہ xxiii پر ایک قصیدے کا حوالہ دیا ہے جو 'دستنبو' میں درج اور ملکہ معظّمہ انگلستان کی غلو آمیز مدح سرائی پر مبنی ہے۔ قصیدہ برگزیدہ در مدح خداوند روئے زمین، سایۂ جہاں آفریں، حضرت قدر قدرت، ملکۂ معظّمہ انگلستان خلد اللہ ملکہ، بالعدل والاحسان، مشتمل بر تہنیت فتح ہندوستان'' درج ہے، جس کا مطلع ہے:

دل روزگار ہا نتواند شمار یافت
خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

غالب نے لارڈ الن برا اور لاڈر کیننگ نواب گورنر جنرل بہادر کو بھی اپنے خاشامدی عریضے روانہ کیے۔ اصل میں غالب کی کمزوری تھی شراب جس کے بنا وہ ایک دن بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے وہ کسی حد تک جا سکتا تھا۔ وہ خود رقم طراز ہے:

''پیتا تھا تو مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ آج کل جب انگریزی شراب بہت مہنگی ہے اور میں سخت قلاش، اگر خدا دوست اور خدا شناس، فیاض اور دریا دل مہیش داس، گنے کی دیسی شراب بھیج کر، جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور مہک میں اس سے بڑھ کر ہے، دل کی آگ پر پانی نہ ڈالتا تو میں زندہ نہ رہ سکتا اور جگر تشنگی کی شدت سے دم توڑ دیتا۔

مدت سے میرا دل اپنی مراد در در ڈھونڈ رہا تھا، اسے جستجو تھی کہ بادۂ ناب کے ایک دو ساغر (کہیں سے) مل جائیں۔

دانش مہیش داس نے مجھے وہ آب (حیات) بخشا جسے سکندر اپنے لیے ڈھونڈتا پھرا تھا۔''

(غالب کے خطوط، جلد اول، از ڈاکٹر خلیق انجم، صفحہ 305-304

غالب اپنی ہر کتاب انگریز افسران کو روانہ کرتا تھا۔ اس لیے احتیاط کے طور پر وہ ان میں ایسی کوئی بات قلم بند نہیں کرتا تھا جو انہیں ناگوار گزرے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہمیشہ ہندوستانیوں کے خلاف ہی لکھا ہے۔ خاص طور سے جنگ آزادی کے دوران اور اس کے بعد۔ اس کے لیے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام کا خط مورخہ صبح پنج شنبہ ستمبر 1858 دیکھا جا سکتا ہے۔

غالب شنبہ 27 نومبر 1858 کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

''ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں، امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب، سادہ بے جلد، ان کو بھیجی تھی۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھے تھے اور وہاں بھئی ایک تماشا اور ہے، وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ 'دستنبو' پہلے اس سے کہ تم بھیجو ''مطبع مفید خلائق'' نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اس کو دیکھ رہے ہیں اور خوش ہو رہے تھے کہ تمہارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ ان کے اس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور کی گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکرتروں کی نذر یہ پارسل انشاء اللہ تعالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

نانہال دوستی کے بر دہد
حالیا رقیم وتخمے کاشیتم

(غالب کے خطوط، جلد اول از ڈاکٹر خلیق انجم، صفحہ 305-304)

خط کی عبارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'دستنبو' کے مواد کی تاریخی حیثیت درست نہیں۔ غالب نے انگریزوں کی خوشامد میں اسے ضبط تحریر میں لایا اور ہندوستانیوں کو حد سے زیادہ برا بھلا کہا، جیسا کہ پچھلے اوراق میں اقتباس درج کیے گئے ہیں۔

غالب کی نثری تحریروں اور اردو خطوط کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب ترقی پسند نہیں بلکہ خوشامد پسند تھا۔

☆☆☆

سید محمد نیر رضوی

# فیضؔ: صوفی ازم سے مارکسزم تک

**فیض** شناسی میں قابل احترام ادیبوں اور قابل اعتماد ناقدین نے خوب خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ تنہائی سے خواب بسیرا تک اور کوئے یار سے سوئے دار تک بیش بہا مقالات ومضامین تحریر کئے گئے ہیں۔ میرؔ وغالبؔ اور اقبالؔ کی شاعری سے فیضؔ تک کی شاعری کا ارتقائی سفر بھی تقابلی مطالعہ کے ساتھ طے کیا گیا ہے۔ فیضؔ کو عصری حسّیت کا نمائندہ شاعر بتانے والوں نے اُن کی مقبولیت کی وجوہات تلاش کرنے کی غرض سے راز دروں خانہ تک رسائی کی ہے۔ فیضؔ کی شاعری کو ترقی پسندی، اشتراکیت اور مارکسزم کے زمرہ میں رکھنے والوں نے عالمی سطح پر اُن کا مقام طے کیا ہے۔ اُن کی مشہور نظموں کا دلکش اور مؤثر تجزیہ پیش کیا ہے۔ ناقدین ادب نے مختلف فکر ونظر کے دائرہ کار کے تحت اُن کے مختلف مجموعہ کلام کا جائزہ لیا ہے۔ غرض اُن کی حیات وشاعری کی افہام وتفہیم پر ہند و پاک میں مقیم فیضؔ شناسوں نے بہترین تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہاں تک کہ فیض احمد فیضؔ کے حوالہ سے فیض شناسوں کی تحریروں پر بھی تبصرے کئے گئے ہیں۔ مگر اس ضمن میں فیضؔ سے متعلق ایک اہم پہلو ابھی بھی تشنہ طلب ہے۔ چنانچہ اس تحقیق طلب پہلو پر بھی تشنگی دور کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ فیض احمد فیضؔ کی شاعری کا وہ ارتقائی سفر جو متصوّفانہ مزاج کی عکاسی سے شروع تو ہوا تھا مگر کیوں کر اور کس طرح انقلابی دور سے گزرتا ہوا بالکل مکمل مخالف سمت یعنی مارکسیت پر ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہٰذا فیض احمد فیضؔ کی پرورش و پرداخت اور اُن کی شخصیت سازی میں کارفرما تمام عوامل کا جائزہ لیتے ہوئے اس خصوصی پہلو پر بھی اہل علم وفن کی توجہ درکار ہے۔ فیض احمد فیضؔ کی پرورش و پرداخت ایک نہایت ہی اعلیٰ وارفع صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی جس کا اثر اُن کی ابتدائی دور کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے جہاں اُن کے متصوفانہ مزاج کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

مثلاً فیضؔ کا یہ شعر دیکھئے جو اُن کے عشقیہ مسلک کا غماز ہے۔

عہد وفا یا ترک محبت جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے ہم سے کیا منواؤ گے

فیضؔ کی ابتدائی شاعری کا زمانہ 35-1934 کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ نقش فریادی، فیضؔ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو 1941 میں منظر عام پر آیا جس کے ابتدائی حصہ میں شاعر کی شاعری میں متصوّفانہ مزاج کا رنگ موجود ہے۔ اس کی ایک جھلک دیکھئے:

ہر حقیقت مجاز ہو جائے — کافروں کی نماز ہو جائے
دل رہین نیاز ہو جائے — بے کسی کارساز ہو جائے

.....

ہمت التجا نہیں باقی — ضبط کا حوصلہ نہیں باقی
اک تری دید چھن گئی مجھ سے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

.....

چشم میگوں ذرا ادھر کردے — دست قدرت کو بے اثر کردے
تیز ہے آج درد دل ساقی — تلخیٔ مئے کو تیز تر کر دے

مگر جب حالات نے کروٹ لیا اور دل کی دنیا بدل گئی تو ذہنی بصیرت بھی بدل گئی۔ اب فیضؔ متصوفانہ شاعری کی عام روایتی دنیا سے باہر آ گئے۔ خود فرماتے ہیں:

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے!

اُردو دنیا کا یہ روایتی عاشق اب انقلاب پسندی کی منازل سے گذرتا ہوا مارکسزم کی جانب گامزن نظر آتا ہے۔ شاعر جس قدر صعوبتیں برداشت کرتا جاتا ہے وہ اپنے خیالات ونظریات میں اُسی قدر شدت پسند ہوتا جاتا ہے اور شاعری بھی اُسی قدر نکھرتی جاتی ہے۔ شاعر اپنے جنون میں اس قدر شدت پسند ثابت ہوا کہ حکومت پاکستان نے 1951 میں فیضؔ کی انقلاب پسندی اور مارکسیت کے پیش نظر اُن کے خلاف راولپنڈی سازش کیس درج کیا اور پھانسی کی سزا مقرر کی جو بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوگئی تھی مگر فیضؔ ہیں:

متاع لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے

چنانچہ وہ فیضؔ جن کی شاعری کی ابتدا متصوفانہ کلام سے ہوئی تھی اب اُنہی کی آخری غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہم ایک عمر سے واقف ہیں اب نہ سمجھاؤ
کہ لطف کیا ہے مرے مہرباں ستم کیا ہے
کرے نہ جگ میں الاؤ تو شعر کس مصرف
کرے نہ شہر میں جل تھل تو چشم نم کیا ہے

ڈپٹی ڈائریکٹر، ڈی ایف پی، حکومت ہند، رانچی، جھارکھنڈ
فون: 08987582814 rizvinaiyar@gmail.com

لحاظ میں کوئی کچھ دور ساتھ چلتا ہے
وگرنہ دہر میں اب خضر کا بھرم کیا ہے

فیض احمد فیض کا نام فیض احمد خان ہے۔ تخلص فیض ہے اور قلمی نام فیض احمد فیض ہے۔ آپ کے والد ماجد کا نام چودھری سلطان محمد خان ہے اور جدّ امجد کا نام صاحبزادہ خان ہے۔ فیض کی پیدائش 13 فروری 1911 میں قصبہ قادر، ضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔ آپ کی تعلیم کا آغاز ہی مسجد سے ہوا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے مسجد میں ہی حاصل کی۔ پھر 1927 میں مشن ہائی اسکول، لاہور سے میٹرک کیا۔ 1929 میں انٹر اور 1931 میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے عربی زبان و ادب میں آنرز کیا۔ پھر اسی کالج سے 1933 میں، انگریزی میں ایم اے کیا اور 1934 میں اورینٹل کالج، لاہور سے عربی میں ایم اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا۔ ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، پنڈت ہر چند اختر اور یوسف سلیم چشتی وغیرہ قابل اُستادوں سے تعلیم حاصل کی۔ فیض نے انجمن اسلامیہ کے مدرسہ میں بھی داخلہ لیا۔ اس مدرسہ میں زیادہ تر غریب بچّوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام تھا۔ فیض یہیں سے غریب بچّوں کی حالت زار کے لئے، اُن کے عدل وانصاف کے لئے اور غربت کے خاتمہ کے لیے غیر شعوری طور پر فکر مند نظر آتے تھے۔ دوسری طرف فیض کے نانا صوفی تھے اور اُنہیں مختلف قسم کی سبق آموز کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ فیض کی ایک بڑی بہن تھیں جن کا نام بی بی گل تھا وہ فیض سے بڑی محبت کرتی تھیں۔ بی بی گل نے بھی آپ کی پرورش میں اسلامی طرز اور مذہبی طور طریقہ کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اس طرح فیض کا وہ تعلیمی سفر جو مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے ذریعہ دیا گیا 'درس ابجد' سے شروع ہوا تھا، اپنی مختلف منازل طئے کرتا ہوا دردمندی، انسان دوستی اور انسانیت کے حصول کے لیئے جدوجہد کرتا ہوا نظر آنے لگا۔ فیض نے 28 اکتوبر 1941 کو ایک فرنگی خاتون ایلیس جارج سے نکاح کیا۔ آپ کی والدہ نے اپنی بہو کا نام کلثوم رکھا۔ کلثوم بظاہر فرنگی ضرور تھیں مگر اُنہوں نے اپنی مغربی تہذیبی روایات کو فراموش کر خود کو مشرقی تہذیب میں مکمل طور پر ڈھال لیا تھا۔ زبان سیکھ لی تھی۔ کلثوم نے فیض کی زندگی میں ہر پریشانی اور آزمائش میں اُن کا ساتھ دیا۔ آپ کی اولاد میں دولڑکیاں پیدا ہوئیں۔ سلیمہ سلطانہ اور منیزہ گل۔ سلیمہ سلطانہ کی شادی شعیب ہاشمی اور منیزہ گل کی شادی ہمیر ہاشمی سے ہوئی۔

فیض کا گھرانہ نہایت شریف، باکردار اور باوقار گھرانہ تھا۔ اُن کے گھر کا ماحول اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار پر مشتمل ایک مذہبی ماحول تھا۔ خانوادہ کی خواتین میں پردہ اور برقعہ لازمی تھا۔ اُن کے والد کا معمول تھا کہ جب وہ فجر کی نماز کے لیئے مسجد جاتے تو فیض کو بھی اپنے ساتھ مسجد لے جاتے۔ نماز کے بعد جیّد عالم و فاضل مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی سے قرآن شریف پڑھتے۔ فیض قرآن شریف کی بہت اچھی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ایک بار علاّ مہ اقبال کی صدارت میں انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جو فیض کی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوا۔ اس موقع پر علاّ مہ اقبال نے فیض کے سر پر نہایت شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا:

''تم کتنے ذہین بچّے ہو''

فیض ساری زندگی اپنے شفیق اُستاد محترم مولوی ابراہیم سیالکوٹی کا ذکر بڑے عزّت واحترام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی صوفیانہ ماحول اور اسی اسلامی طرز پر دی گئی تربیت کا اثر تھا کہ فیض میں ساری زندگی زبردست قوت برداشت رہی۔ انہیں غصّہ نہیں آتا تھا اور غم کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ برداشت کر لینے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ فیض کے والد کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ فیض اپنے والد کے ساتھ ایک صوفی درویش حضرت فیض الحسن کے یہاں اکثر و بیشتر جایا کرتے تھے۔ فیض کو درویش فیض الحسن کی شاعری بہت پسند تھی۔ ایک اور گاؤں جس کا نام ''آلومہار'' تھا، وہاں بھی ایک پیر صاحب رہتے تھے۔ فیض اپنے والد کے ہمراہ وہاں بھی جاتے تھے۔ چنانچہ فیض کی پرورش و پرداخت، بصیرت و بصارت، اُن کے ذہنی ارتقاءٔ اور مکمل شخصیت سازی میں، اُن کے گھر کا صوفیانہ مزاج، مذہبی ماحول، غریب و نادار بچوں کی حالت زار کی فکر، صوفیائے کرام کی صحبت، نانا کی سبق آموز کہانیاں، اُن کے والدین اور خصوصاً بہن بی بی گل کی عطا کردہ تربیت کے ساتھ ساتھ ایسے ہی دیگر شائستہ عوامل کارفرما رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض نے ایک بار کینیڈا میں ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا کہ:

''میں اپنے آپ کو ادنیٰ طریقے سے تصوف کا پیرو سمجھتا ہوں۔ اس مسلک پر تھوڑا بہت اختلاف ہوتا ہے۔ ہماری تو ساری کی ساری تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی اور میری شاعری کا میرے ذہنی عقائد سے کوئی تضاد نہیں۔''

فیض کی ابتدائی شاعری کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ کی قدریں منتشر ہو چکی تھیں۔ جوشؔ، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ، مجازؔ اور ساغرؔ جیسے شعراءٔ کی شاعری کی وجہ سے عصری ادب کا رجحان ایک نئی کروٹ بدل رہا تھا۔ کہیں ہنگامی اور رومانی کیفیت تھی، کہیں احساس محرومی، کہیں نرم و نازک لب ولہجہ میں عشق اور انقلاب کے سُر تھے تو کہیں وجدانیت کے ساتھ ساتھ ماورائیت بھی ادب کو اپنے تصرف میں لے رہی تھی۔ مگر حقیقت ابھی بھی یہی تھی کہ عصری تقاضوں کے مدّ نظر شاعری کی روایتی اقدار میں متذکرہ چند تبدیلیوں کے باوجود یہ زمانہ، کسی حد تک مروّجہ روایتی شاعری کا ہی زمانہ تھا کیونکہ شاعر اب بھی روایتی عاشق ہی تھا۔ بس محبوب کی قدر و قیمت کی نوعیت میں کسی حد تک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ دبستان لکھنؤ کی شاعری میں اب تخلیقی سحر کاری ختم ہو رہی تھی۔ اس کی جگہ مُلک کو برطانوی سامراجیت سے آزادی دلانے اور غلامی سے نجات دلانے کا جذبہ، معاشرہ کی تلخ حقیقتوں کے پیش نظر تجربات کی توانائی، جوش و ولولہ کے ساتھ ساتھ نیرنگ خیال، مختلف النوع جدّتیں اور نئی نئی قدریں اب شاعری میں اپنا اپنا مقام تلاش کر رہی تھیں۔ محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب علاّ مہ اقبالؔ نے بھی اشتراکیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور حسرت موہانی جیسا معروف و مقبول شاعر کی شاعری کا رنگ تغزل بھی اشتراکیت کی جانب مائل ہونے لگا۔ بہرحال فیض احمد فیض کا مطالعہ وسیع ہوتا جاتا اور اسی کے ساتھ ساتھ اُن کے تجربات و مشاہدات کی دنیا بھی وسیع تر ہوتی جاتی۔ فیض جب محض دس گیارہ سال کے رہے ہوں گے کہ ابھی ابھی عالم گیر لڑائی ختم ہوئی تھی اور اُن کی سماعت سے جو آوازیں ٹکرا رہی تھیں وہ آوازیں مارکس اور لینن کی قیادت میں روس میں رونما انقلاب کی آوازیں تھیں جہاں زار شاہی کا تختہ پلٹ کر مزدوروں کی حکومت قایم ہوئی تھی اور دنیا اُسے ''سرخ انقلاب'' کے نام سے موسوم کر رہی تھی۔ اتفاق یہ ہے کہ یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان میں بھی جلیان والا باغ کا المناک حادثہ پیش آیا جہاں انگریزوں نے بربریت کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ سے مُلک میں غم وغصّہ کی لہر دوڑ گئی

اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں مزید تیزی آئی۔ چاروں طرف احتجاجی جلسے ہونے لگے ۔ چنانچہ سیالکوٹ میں بھی احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔'' سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور'' سرکٹانے کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے''، جیسے اشعار نے نعروں کی شکل اختیار کرلی جس نے عام عوام کے قلب وجگر کو پوری طرح گرمادیا۔

فیضؔ کم عمر ضرور تھے مگر اُن کا ذہین ذہن، پس منظر اور پیش منظر کی معنویت تلاش کررہا تھا۔فیضؔ وقت کے ساتھ بڑے ہورہے تھے۔اب فیضؔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے سیالکوٹ سے لاہور آگئے۔حالات نے کروٹ لی۔ ماحول بدل گیا۔ یہاں اُن کی ملاقات کامریڈ خورشید انور سے ہوئی۔خورشید انور نے انہیں خفیہ باغی قسم کا لٹریچر پڑھنے کا شوق دلایا۔اب فیض کے دل کی دنیا بدلنے لگی اور وہ اب حق کی جگہ حقیقت تلاش کرنے لگی۔روس کے انقلاب سے لے کر یہاں اپنے وطن، ہندوستان میں بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، کاکوری کیس، میرٹھ کا سازشی معاملہ اور اسی طرح کے روز روز رونما ہونے والے دیگر واقعات وحوادث کے مفہوم سمجھ میں آنے لگے۔فیضؔ نے جب انگریزی زبان وادب میں ایم اے کیا تو اُنہوں نے انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ یورپی ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ہٹلرزم اور فاشزم کے مفہوم کو اچھّی طرح سمجھا۔ظلم کے توڑ کے طور پر سوشلزم اور مارکسزم کے مفاہیم و مطالب میں اُن کی دلچسپی بڑھنے لگی۔اور دلچسپی بھی جنون کی حد تک بڑھ رہی تھی۔اُنہوں نے کمیونسٹ مینی فیسٹو جو اُن دنوں ممنوع ہوا کرتا تھا، اُس کا ڈوب کر مطالعہ کیا اور اسی طرح کے دیگر لٹریچرس کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا۔مشہور ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر، محمود الظفر اور رشید جہاں وغیرہ کے رابطہ میں آئے۔اس طرح فیضؔ نے بہانگ دہل اشتراکیت قبول کرلی۔مارکسزم نے اُنہیں اور اُن کی شاعری کو ایک نئے انداز کا انقلابی رُجحان عطا کیا۔حالانکہ دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ کبھی بھی دُنیا کی کسی بھی اشتراکی جماعت کے رُکن نہیں رہے۔اب فیضؔ کے سامنے اُس روس کی حقیقت سامنے تھی جہاں مزدور طبقہ بااختیار ہوا تھا اور اس نے حکومت قایم کی تھی۔دوسری جانب فیضؔ کے پیش نظر یہاں ہندوستانی سماج کی حقیقت بھی سامنے آنے لگی جہاں جدّ وجہد آزادی خود جدّ وجہد کے مراحل سے گزر رہی تھی۔فیضؔ پوری دنیا میں جاری ظلم واستبداد، جبر وتشدد، عدل وانصاف سے عاری دنیا، کمزوروں کی بے بسی، امراء کی عیاشی، نام نہاد علما اور دانشوروں کی عیاری، طبقاتی کشمکش، ظلم وستم کا مداوا، اور ایسے ہی سیکڑوں مسائل کا پرامن حل اپنے وضع کردہ وسیع تر تناظر میں تلاش کرنے کے سلسلے میں ایک اضطرابی کیفیت سے دوچار تھے۔مضطرب داخلی تقاضے خارجی صورت حال سے نبرد آزما تھے۔چنانچہ اس اضطرابی کیفیت نے اُن کی شاعری میں مزید نکھار پیدا کیا۔اس طرح فیضؔ جو کبھی صوفی فیضؔ ہوا کرتے تھے، اب اشتراکی فیضؔ ہوگئے۔اُن کی شاعری کا رُخ بدل گیا۔موضوعات کی داخلیت تبدیل ہوگئی۔فیضؔ کی شاعری میں اُن کے اس بدلے ہوئے مزاج کی عکّاسی دیکھئے:

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بدلے بدلے اس رنگ تغزل کا ایک اور رُخ دیکھئے:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
میدان وفا دربار نہیں یاں نام ونسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں کچھ عشق کسی کی ذات نہیں
گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگادو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

یہ صحیح ہے کہ رُخ بدلا ہے۔یقیناً بدلا ہے مگر اب بھی اُن کی اشتراکی رنگ وآہنگ میں ڈوبی چند اہم نظمیں بالخصوص 'شورش زنجیر بسم اللہ'، 'بول' اور 'چند روز اور مری جان' وغیرہ نظموں کا تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نہایت موزوں، متوازن اور نغمگی کی روح سے لبریز اِن نظموں میں موجود'' جگر پاش درد وفغاں اور سوز وساز'' کا محرک اب بھی تصوف ہی میں نظر آتا ہے۔چنانچہ'' شورش زنجیر بسم اللہ'' کا آغاز ملاحظہ کیجیے:

ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دار وگیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورش زنجیر بسم اللہ
درزنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں درد دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

فیضؔ نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی کا رخ کیا۔مگر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کامیابی نہیں مل سکی۔فیضؔ نے جب تعلیم مکمل کرکے تلاش معاش کے لئے جدّ و جہد شروع کی تب اُنہیں نوجوانوں کی بے روزگاری، مزدوروں اور کسانوں کی فاقہ کشی، عورتوں اور بچّوں کے حقوق کی پامالی، اور اقتصادی بحران جیسے مسائل سے نبرد آزما ہوئے۔فیضؔ کی سوچ اور ان کا نظریہ اشتراکیت مزید مستحکم ہوتا چلا گیا۔اب پریشانی و مشکلات خواہ کیسی بھی ہوں، علم کے ساتھ عمل کا یہ سلسلہ رکنے والا نہیں تھا۔حکومت پاکستان، اُن کی اسی مارکسیت اور انقلاب پسندی کی وجہ سے گرفتار کرتی رہی۔مگر فیض احمد فیضؔ کے لئے اب تو مسلسل گرفتاری کا یہ غم اب غم جاناں سے کہیں دور نکل کر غم دوراں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ قید وبند کے مصائب اور دیگر صعوبتیں اُن کی زندگی کا حصّہ بن گئیں۔مگر فیض جو اُردو شاعری کے ہیرو تھے، بہادر تھے، رونے رُلانے اور شکوہ شکایت میں یقین نہیں رکھتے تھے۔بس اپنے خیالات ونظریات کے مطابق اپنے حصہ کا چراغ جلاتے جاتے تھے۔لہٰذا اُن کی شاعری خوب سے خوب تر ہوتی گئی اور روز بروز نکھرتی چلی گئی۔فیضؔ کا پہلا مجموعہ کلام'' نقش فریادی'' جب منظر عام پر آیا تو عالمی ادب میں ایک تہلکہ مچ گیا اور سیاسی اُفق پر بھی اس کے اثرات نمودار ہونے لگے۔فیضؔ اپنے گردوپیش رونما ہورہے سیاسی، ادبی اور تہذیبی حالات وواقعات سے بخوبی واقف تھے۔فیضؔ بُنیادی طور پر رومانیت سے لبریز صوفی شاعر بن کر اُبھر رہے تھے مگر جب وہ ان مراحل سے گزرے تو تصور انقلاب نے اُن کی دُنیا بدل ڈالی۔اُن کا خواب عشق اور خواب انقلاب اب عملی زندگی میں تعبیریں تلاش کرنے لگا۔اسی تلاش تعبیر کی وجہ سے فیضؔ کو وہ آفاقیت حاصل ہوئی کہ فیضؔ کی شاعری میں عشق عام روایتی شاعر کے عشق کے مقابلہ میں بالکل جدا جدا نظر آنے لگا۔انہوں نے اس دوران کبھی کالج میں ملازمت کی تو کبھی اخبار

ورسائل کی ادارت کی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ بھی ہوئے۔ سوویت یونین، چین، ہندوستان، کیوبا، لبنان، مصر، الجیریا، عراق، شام، امریکہ، بنگلہ دیش، جینیوا، ہنگری اور بیروت وغیرہ ملکوں کا دورہ کیا۔ دریں اثنا دوسری جنگ عظیم میں اتحادیوں کی جیت ہوئی۔ فیضؔ کو اب بیک وقت اُردو زبان وادب، فارسی زبان وادب، انگریزی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب پر بھی عبور حاصل ہو چکا تھا۔

صوفی فیضؔ اب صوفی فیضؔ نہ رہے، تصوف سے دور نظریہ اشتراکیت میں مسائل کا حل ڈھونڈتے نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں اب موضوعات، مشمولات، ہیت، لب ولہجہ، اسلوب وتراکیب، رویّہ اور رنگ تغزل سب کچھ بدل چکا تھا۔ اب تو بس اشتراکیت ہی غالب ہے! چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم، مشق ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارہ
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

قید خانہ سے فیضؔ کی پرسوز صدا سنئے:

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے، جسم وجاں بچا کے چلے

اس انقلاب پسند عاشق کا سوز وگداز دیکھئے:

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی!
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

فیضؔ کی شاعری میں حقیقت پسندی دیکھئے:

چشم نم، جان شوریدہ کافی نہیں
تہمت عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دشت افشاں چلو، مست ورقصاں چلو

بین الاقوامی سطح پر انقلاب کا ہمہ گیر تصور دیکھئے:

ہم محنت کش جگ والوں سے جب اپنا حصہ مانگیں گے
ایک کھیت نہیں، ایک دیش نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے
یاں پربت پربت ہیرے ہیں یا ساگر ساگر ہیں موتی
یہ سارا مال ہمارا ہے ہم سارا خزانہ مانگیں گے

اس طرح فیضؔ نے اپنے مخصوص نظریہ کے تحت اپنی شاعرانہ شہرت کو قائم رکھتے ہوئے 'بول'، 'لہو کا سراغ'، 'دریچہ'، 'کتے'، 'تنہائی'، 'اُدھر نہ دیکھو'، 'چند روز اور مری جان'، 'صبح آزادی'، 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے'، 'نثار میں تری گلیوں پہ'، 'درد آئے گا دبے پاؤں'، 'خواب بسیرا' اور 'آج بازار میں پا بجولاں چلو' وغیرہ نہایت ہی خوبصورت اور شاہکار نظمیں دیں۔ فیضؔ کے مقبول ترین مجموعہ کلام میں نقش فریادی (1941)، دست صبا (1952)، زنداں نامہ (1956)، دست تہ سنگ (1965)، سر وادیٔ سینا (1971)، شام شہر یاراں (1978)، مرے دل مرے مسافر (1981)، غبار ایام (1989)، وغیرہ نہایت ہی قابل ذکر ہیں جو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ نثر میں بھی فیضؔ کی چند تصانیف منظر عام پر آئیں جیسے تنقیدی مضامین کا مجموعہ میزان (1962)، صلیبیں مرے دریچے میں (1971)، متاع لوح وقلم (1973)، سفر نامہ کیوبا (1974) ہماری قومی ثقافت (1976) اور مہ وسال آشنائی (1980)، وغیرہ۔ فیضؔ کی غزلیں، نظمیں اُن کی نثری تصانیف وتخلیقات اور دیگر نگارشات نے اُنہیں وہ آفاقیت بخشی کہ اُس نے اُنہیں بین الاقوامی سطح پر میر وغالبؔ اور اقبالؔ کے بعد لا کر کھڑا کر دیا۔ اس طرح فیض احمد فیضؔ نے صوفی ازم سے مارکسزم تک کا سفر نہایت ہی کامیابی سے طئے کیا۔ اُنہوں نے اُردو شاعری کو روایتی شاعری سے نکال کر انقلابی شاعری کی جانب موڑ دیا اور اسے بھی نئے رویّہ، نئے رنگ وآہنگ اور نئے رجحان سے روشناس کرایا۔ شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کی ایسی حسین آمیزش پیش کی جو نئی نسل کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ فیضؔ کا انتقال 20 نومبر 1984 کو لاہور میں ہوا۔ مگر فیضؔ امر ہو گئے۔

سوز ہے دل میں نگاہوں میں محبت کا گداز!
ایک بجلی ہے کہ جو شعلہ فشاں ساز میں ہے
کاٹ تلوار کی شعروں کو عطا کرتی ہے
وہ کسک درد کی جو فیضؔ کی آواز میں ہے

سردار جعفری

☆☆☆


## دہلی میں ماہنامہ آجکل کے فروخت مراکز

**بُک گیلری، پبلی کیشنز ڈویژن**
سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

**پبلی کیشنز ڈویژن، ہال نمبر196**
اولڈ سکریٹریٹ۔ دہلی۔110054 فون:011-23890205

**ایم ایل اینڈ سنس**
شیواجی اسٹیڈیم کمپلیکس، بھگت سنگھ مارگ، نئی دہلی۔110001

**مکتبہ جامعہ لمیٹڈ**
اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006 فون:011-23260668

**شمسی بک ڈپو**
بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

**ظہیر الدین نیوز پیپر ایجنٹ**
نزد غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013
فون:9818593958

ڈاکٹر سید حسنین اختر

# گاندھی جی اور ہندوستانی زبان

**موہن داس** کرم چند گاندھی ایک تاریخ ساز شخصیت کا نام ہے۔ وہ پختہ عزم اور زبردست حوصلہ کے مالک نیز اصولوں کی پابندی کا مظاہرہ کرنے والے شخص تھے۔ انھوں نے اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا۔ مہاتما گاندھی کا اثر صرف ہندوستان تک محدود نہیں رہا، بلکہ اُن کی تحریک کی بازگشت اور اُن کے نظریات کی تاثیر دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی سنی اور دیکھی گئی۔ گاندھی جی کے قومی اتحاد، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور عدم تشدد سے متعلق نظریات کی ہر دور میں معنویت رہے گی۔ خاص طور پر آج کے ہندوستان میں جہاں جگہ جگہ فرقہ وارانہ آگ لگی ہوئی ہے اور عصبیت وتنگ نظری ہندی معاشرے کو کھوکھلا کر رہی ہے، وہاں آج گاندھی جی کے نظریات کو بخوبی سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔۔ گاندھی جی نے بھائی چارہ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی اتحاد پر زبردست زور دیا، تاکہ ہندوستان کی سالمیت برقرار رہے اور وہ جنت نشاں بن سکے۔ اُن کا مسلک سروودھرم سبھاؤ تھا، وہ جیو اور جینے دو کے اصول پر گامزن رہتے تھے، وہ ہندوستان کی بقا اور سالمیت چاہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان ایک رہے اور یہاں کے باشندے چاہے اُتّر کے ہوں یا دکھّن کے، پورب کے ہوں یا پچھّم کے، ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، ایک دوسرے کے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہیں۔

قوموں اور ملکوں کو جوڑنے میں زبان کا بھی بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعے ہی لوگ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں، اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور اپنے احساسات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس چیز کو محسوس کرتے ہوئے ایک ایسی زبان کی وکالت کی جو عوام میں رائج تھی، عوامی زبان تھی، گھر بازار اور میلوں ٹھیلوں کی بولی تھی۔ گاندھی جی کا ماننا تھا کہ یہ عوامی زبان جس کو عرفِ عام میں ہندوستانی کہا جاتا ہے اور جو ہندوستان کے اکثر وبیشتر علاقوں میں بولی سمجھی جاتی ہے، ملک کی ترقی، سالمیت وبقا اور یکجہتی میں اپنا کلیدی کردار ادا کرے گی۔ چنانچہ 1920 میں ہندوستانی پرچار سبھا کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستانی پرچار سبھا کی شاخیں ہندوستان کے کونے کونے میں کھولی گئیں۔ گاندھی جی کے نظریۂ ہندوستانی کی حمایت ہندوستان کے تقریباً سبھی سربرآوردہ حضرات نے کی، اُن میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر راجندر پرساد، مولانا آزاد، سردار پٹیل، آصف علی اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔ گاندھی جی ہریجن سیوک کے مورخہ 9 اگست 1942 کے شمارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ہندوستانی پرچار سبھا نے اپنا کام پورے جوش کے ساتھ شروع کر دیا ہے۔ یہ سبھا ایسے کارکنوں کی ایک جماعت ہے جو سبھا کے سندیش اور مشن پر عقیدہ رکھتے ہیں، سبھا کا سندیش یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان انگریزی نہیں بلکہ ہندوستانی یعنی ہندی اردو ہے۔ کانگریس کے ہندوستانی سے متعلق رزولیوشن تیار کرنے والے ہندی ساہتیہ سمّیلن کے روح رواں شری پرشوتم داس ٹنڈن ہی تھے، انھوں نے مجھے یہ بات بالکل صاف طریقے سے سمجھائی تھی کہ آج کی حالت میں ہندوستانی کا مطلب ہندی اور اردو ہونا چاہئے''۔(۱)

گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندوستانی زبان عربی، فارسی وسنسکرت کے دقیق ثقیل اور بوجھل الفاظ سے آزاد ہو جسے تمام لوگ سمجھ سکیں اور بول سکیں۔ ہندوستانی کی ماہیت کے بارے میں اُن کا ماننا تھا:

۱۔ ہندی ہندوستانی اور اردو کے لفظ ایک ہی زبان کا پتہ دیتے ہیں جو اُتر بھارت کے ہندو ومسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔

۲۔ اردو کا لفظ رائج ہونے سے پہلے اس زبان کے لیے ہندو ومسلمان دونوں ہندی کا لفظ استعمال کرتے تھے۔

۳۔ ہندوستانی کا لفظ بھی بعد کو اسی زبان کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

۴۔ ہندوؤں ومسلمانوں دونوں کو ایسی زبان بولنا چاہئے جسے اُتّر بھارت کے زیادہ تر لوگ سمجھ سکیں۔(۲)

مولوی عبدالحق اردو کے اور ڈاکٹر راجندر پرشاد ہندی زبان کے زبردست داعیان میں شمار ہوتے ہیں، ان دونوں کے درمیان زبان سے متعلق ایک گفتگو ہوئی اور دونوں نے مشترکہ بیان جاری کیا، اس سلسلے میں گاندھی جی ہریجن کے 11 ستمبر 1937 کے شمارے میں لکھتے ہیں:

> ''پٹنہ میں 28 اگست 1937ء کو بہار اردو اکیڈمی کے اجلاس کے موقع پر ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر آپس میں اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اردو ہندی ہندوستانی کی بحث میں بدقسمتی سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کر دیں اور ہمیں بڑی خوشی ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے کے بعد ہم نے اس کے مختلف نکتوں کے متعلق آپس میں کافی اتفاق رائے پایا، ہم اس بات پر ایک رائے ہیں کہ ہندوستانی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہو اور اردو و دیوناگری دونوں حرفوں

شعبہ عربی، دلّی یونی ورسٹی، دلّی
akhtarsyed11@gmail.com فون:8447451481

میں لکھی جائے اور تمام سرکاری اور تعلیمی کام کاج کے لیے ان دونوں لکھاوٹوں کو تسلیم کرلیا جائے''۔(۳)

گاندھی جی کے نزدیک ہندوستانی سے مراد شمالی ہند میں بولی جانے والی مشترکہ زبان ہے، انھوں نے اس بات کی طرف جگہ جگہ اشارے بھی دیے اور کھل کر ذکر بھی کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ شمالی ھند میں بولی جانے والی زبان کو بنیادی حیثیت حاصل ہو اور اُسی کے الفاظ کو عام کسوٹی بنایا جائے، وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستانی سے ہم اتّری ہندوستان میں بولی جانے والی زبان کے زیادہ تر مشترکہ حصے کو مراد لیتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس زبان کے لغت کے لیے لفظ ڈھونڈنے اور اُن کو شامل کرنے میں اُن لفظوں کے عام استعمال ہی کو کسوٹی بنانا چاہئے۔ ہماری یہ بھی رائے ہے کہ اردو ہندی دونوں ادبی زبانوں کے لیے ترقی کرنے کے پورے پورے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں۔ ہماری تجویز ہے کہ اردو اور ہندی کے عالموں کی مدد سے ہندوستانی لفظوں کا ایک بنیادی لغت تیار کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے''۔(۴)

گویا کہ گاندھی جی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اردو اور ہندی کی موجودہ شکل کو ختم کردیا جائے، بلکہ ان دونوں کے مستقل وجود کو وہ ضروری سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان کی قومی زبان ان دونوں زبانوں کے الفاظ سے بنے، وہ چاہتے تھے کہ اردو والے ہندی سیکھیں اور پڑھیں اور اسی طرح ہندی والے اردو پڑھیں، وہ مولوی عبدالحق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''بھائی صاحب!

آپ کا تار ملا، مجھے دُکھ ہے کہ آپ کے جلسہ میں حاضر نہیں ہوسکتا ہوں، میری امید ہے کہ جلسہ ہر طرح کامیاب ہوگا، آپ جانتے ہیں کہ میں اردو زبان کی ترقی چاہتا ہوں، میرا خیال ہے کہ سب ہندو جو ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اردو سیکھیں اور مسلم ہندی سیکھیں''۔(۵)

مختصر یہ کہ گاندھی جی ملک میں قومی زبان کا درجہ اس بھاشا کو دینا چاہتے تھے جو عوامی ہو، وہ زبان جو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب ہر طرف سمجھی جاسکے، میلوں ٹھیلوں کی بولی ہو جس کو جتنا سمجھتی ہو اور بولتی ہو اور وہ زبان شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہی ہوسکتی ہے جو اردو اور ہندی زبانوں کا مرکب ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں سنسکرت اور عربی و فارسی کے مشکل الفاظ نہ ہوں، اُسے عوام بولتے ہوں اور سمجھتے ہوں، لیکن آج بہت افسوس ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرکاری طور پر ایسی بھاشا کا پریوگ ہو رہا ہے جو نہایت مشکل ہے اور بھاری بھرکم الفاظ کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے، جسے عوام نہ سمجھتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ آج 'گنتوئیے' کون بولتا ہے، 'ابھیپتا' کا استعمال روزمرہ کی بولی میں کون کرتا ہے۔ ہم اگر گاندھی جی کے سچے چاہنے والے ہیں تو ہمیں ایسی بھاشا کا پریوگ کرنا چاہئے جسے سب لوگ سمجھیں اور بول سکیں۔

## مصادر


۱۔ گاندھی جی او رزبان کا مسئلہ، مترجم عشرت علی صدیقی، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ 1980ء، ص:142

۲۔ ایضاص:97

۳۔ ایضاص:98

۴۔ ایضاص:99

۵۔ مولوی عبدالحق کے نام گاندھی جی کا وردھا سے لکھا گیا خط، مورخہ 26 دسمبر 1939


☆☆☆

# وفیات

☆ ممتاز مصنف، محقق، شاعر اور کالم نگار **ڈاکٹر سلیم اختر** کا 84 برس کی عمر میں 30 دسمبر 2018 کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر 100 سے زائد کتابیں تحریر کیں، وہ ایک عرصہ تک گورنمنٹ کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر 11 مارچ 1934 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین تخلیق کار بھی تھے۔ ان کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' اردو ادب کی اب تک لکھی گئی تاریخوں میں ایک اہم حوالہ تصور کی جاتی ہے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔

☆ کشمیر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور کہنہ مشق شاعر و ادیب **حامدی کاشمیری** کا انتقال کر گئے۔ مرحوم نے زندگی کی 86 بہاریں دیکھ کر 26 دسمبر 2018 کی رات کے آخری پہر کو سری نگر میں واقع اپنی رہائش گاہ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ حامدی کاشمیری اردو اور کشمیری زبان کے نابغۂ روزگار شاعر اور ادیب تھے۔ حامدی کاشمیری نے کم وبیش 50 کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جن میں معاصر تنقید، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، جدید کا شر شاعری، شیخ العالم اور شاعری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

☆ اردو اور ہندی کے جدید لب ولہجہ کے شاعر اور مترجم **روشن لال روشن** 4 دسمبر 2018 بروز منگل رات ساڑھے نو بجے شہر بنارس میں اپنے ایک رشتہ دار کے گھر جہاں وہ صاحب فراش تھے، رحلت کر گئے۔ اس طرح روشن لال روشن کی پرورش اور دم آخر تک ان کی گزر بسر بنارس میں ہی ہوئی اگرچہ جزوقتی ملازمتوں کے سلسلے میں یہ ہندوستان کے کئی شہروں میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لیے رہے مگر مزاج میں ایک ہیجان اور بے چینی کے سبب وہ کہیں بھی دلجمعی سے کام نہ کرسکے۔ شعر و ادب سے والہانہ محبت اور کچھ گھریلو پریشانیوں کے سبب وہ شادی بیاہ بھی نہ کرسکے تھے۔

مرحوم اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں میں یکساں تخلیقی صلاحیت اور قدرت رکھتے تھے۔ اس طرح ان کی تخلیقات دونوں ہی زبانوں کے معتبر اور معیاری رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کے اب تک تین مجموعہ ہائے کلام ''لب اظہار (اردو)''، 'ہماری بستی میں (ہندی)' اور 'سے سنواد کرنا چاہتا ہے (ہندی)' منظر عام پر آکر ادب کے سنجیدہ حلقے میں اپنا اعتبار قائم کرچکے ہیں۔ (مرسلہ: عارف ہندی)

☆ فلمی دنیا کے عظیم اداکار، اسکرپٹ رائٹر اور ڈائیلاگ لکھنے والے **قادر خان** کا 31 دسمبر 2018 کو کینیڈا میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 81 سال تھی۔ اپنے 43 سال کے فلمی کریئر میں انہوں نے 300 سے زائد فلموں میں کام کیا اور تقریباً 250 فلموں کے ڈائیلاگ لکھے۔ وہ معاون اداکار، ولن، کامیڈین اور کریکٹر ایکٹر ہر قسم کے کردار میں خود کو مکمل طور پر ڈھال لیے تھے۔ انہوں نے 1970 اور 1980 کی دہائی میں کئی فلموں کی اسکرپٹ اور ڈائیلاگ لکھے تھے اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دل دیوانہ، بے نام، عمر قید، اناڑی، بیراگ، خون پسینہ، پرورش، مقدر کا سکندر، مسٹر نٹور لال، سہاگ، عبداللہ، دو اور دو پانچ، قربانی، یارانہ، بلندی اور نصیب جیسی بہت سی فلمیں کیں۔ ان فلموں کی کامیابی کے بعد قادر خان کا فلمی صنعت میں دبدبہ قائم ہوگیا تھا۔ وہ فلموں میں کریئر بنانے سے پہلے سول انجینئرنگ کے طالب علموں کو پڑھایا کرتے تھے۔

ادارہ مرحومین کیلئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے صبر کی دعا کرتا ہے۔

ڈاکٹر اشرف آثاری

# پروفیسر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کا انفراد

''**دسمبر** کی زمہریری ہوائیں آپ کو ہم سے چھین کر ملکِ عدم کی طرف لے تو گئیں لیکن آپ آج بھی ہمارے دل و ذہن میں ایسے زندہ و تابندہ ہیں جیسے کہیں گئے ہی نہ تھے اور ہمارے بیچ، اپنی مسکراہٹیں بکھیر رہے ہو۔ نگینہ انٹرنیشنل اور اراکین نگینہ پیر شمس الدین حیرت پاندانی، راماند ساگر، علی محمد لون، محی الدین شاہ، بشیر اختر، عمر مجید، سید رضا، ارجن دیو مجبور، غلام نبی فراق، حکیم منظور، محمد احمد اندرابی، محمد امین اندرابی، فرید پربتی، سجاد حسین، عباس تابش، گلزار حضر تبلی، عبدالغنی نمتہ ہالی، آنند لہر آپ کی علمی، فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو آج بھی یاد کرتے ہیں اور آپ کو سلام بھی کرتے ہیں:

بزمِ ہستی میں ہے سب کو محفل آرائی پسند
ہے دلِ شاعر کو لیکن کنجِ تنہائی پسند

آج آپ جس کنجِ تنہائی میں ہیں، اے کاش وہ بھی آپ کے لئے محفل آرائی بنے.....؟ آمین۔

23 دسمبر 2018 کو نگینہ انٹرنیشنل کے سالنامہ کی تقریبِ رونمائی پر ہوٹل شہنشاہ پیلس کے ادبی ہال میں ایک علمی و ادبی کہکشاں کی موجودگی میں ایک اسٹینڈی پر او پر کوٹ کی گئی تحریر دیکھ کر ہی شاید ایوانِ صدارت میں تشریف فرما تقریب کے صدر محترم جسٹس (ر) بشیر احمد کرمانی، محمد یوسف ٹینگ، نور شاہ، پروفیسر محمد زماں آزردہ اور وحشی سعید کے علاوہ غلام نبی خیال صاحب نے اپنی فکر انگیز تقریر میں دسمبر کے مہینے میں کئی سر بر آوردہ شخصیات، جیسے معروف صحافی، قلمکار اور 'روزنامہ 'سری نگر ٹائمز' کے بانی مدیر صوفی غلام محمد اور ان کے شاہکار افسانہ کا ذکر بھی کیا جو ظ انصاری کی ادارت میں نکلنے والے شمع گروپ کے 'آئینہ' میں چھپ کر مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ چکا تھا۔ یا پھر راماند ساگر، حکیم منظور، فرید پربتی، عمر مجید، آنند لہر وغیرہ اشخاص کا، جو اسی دسمبر کے مہینے میں، اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے ہیں۔ لیکن ان کی جو خاص بات مجھے یہاں کوٹ کرنی ہے کہ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ابھی دسمبر کے کئی دن باقی ہیں کیا پتہ 2018 کا یہ دسمبر کیا گل کھلائے گا؟ کسے خبر تھی کہ جاتے جاتے دسمبر 2018 بھی اہل اردو سے بہت کچھ چھین کر لے جائے گا۔ اسی دسمبر نے اپنے ابتدائی ایام میں آنند لہر جیسے افسانہ نگار کو ہم سے چھینا ہے اور اب پروفیسر حامدی کاشمیری کو بھی چھین لیا ہے۔

صدرہ بل حضرت بل سری نگر (کشمیر) 190006
فون: 9419017246 dr.ashraf.asari@gmail.com

26 دسمبر کی رات دس بجے کے آس پاس اردو زبان و ادب کی بین الاقوامی شہرت کی حامل یہ علمی و ادبی شخصیت ہم سے جدا ہوگئی جن کی بے شمار خدمات کے سرسری جائزے کے لئے بھی کافی وقت اور صفحات درکار ہوں گے۔ جنہوں نے اردو نثر و نظم کی ہر صنفِ سخن، خاص طور پر شاعری، فکشن اور تنقید میں نہ صرف نام کمایا بلکہ اپنی منفرد اور مخصوص فکر و سوچ اور اسلوب و آہنگ سے نئے نئے تجربے کئے اور ان موضوعات پر مستقبل میں کام کرنے والوں کے لئے آسانیاں بھی پیدا کیں اور اپنے فکری اور فنی اختصاص سے نئے نئے امکانات و مباحث کے دریچے بھی وا کئے۔ اپنے ابتدائی زمانے میں حامدی صاحب اردو فکشن کے ساتھ وابستہ رہے اور اس دوران ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول وغیرہ منظر عام پر آ کر مقبولِ عام ہوگئے۔ ملک اور بیرونِ ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ، اس عمر میں بھی چھپتے رہنے کا مشغلہ انہیں پسند تھا اس لئے انہیں اردو کے ان قلمکاروں میں ہرگز شمار نہیں کیا جاسکتا جو 80 نوے کی عمر کو پہنچتے پہنچتے تھک ہار کر، ہاتھ پیر سمیٹ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ مرحوم بزرگی اور ضعف کی وجہ سے رعشہ طاری رہنے کے باوجود بھی آخری دم تک، ایک باہمت مجاہد اردو کی طرح ہی قلم کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے اور ہر معیاری رسالے میں ان کی تخلیقات، خاص طور پر شاعری نظر سے گزرتی ہی رہتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے بحروں میں ان کے مخصوص آہنگ و انداز اور لب و لہجے میں ان کی غزلیں آج بھی اتنا ہی متاثر کرتی ہیں جتنا آج سے تین چار دہائیاں قبل کیا کرتی تھیں۔ ہاں البتہ عام جسمانی کمزوریوں اور رعشہ نے لکھنے اور تکلم کی صلاحیتوں کو سلب کر کے رکھ دیا تھا۔ بہت خوش خط اور شیریں گفتار ہونے کے باوجود بھی آج ان کی تحریریں بہت مشکل سے پڑھی اور باتیں سمجھی جاتی تھیں۔

ہر برس نگینہ انٹرنیشنل کے توسل سے ہونے والی ادبی نشستوں کے انعقاد کے ضمن میں نور شاہ اور وحشی سعید کے ساتھ مرحوم کے دولت کدہ پر جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، انتہائی تپاک سے ملتے تھے اور اپنے مستقبل کے منصوبوں سے بھی واقف فرماتے تھے، کئی بار اپنی علالت کے باوجود بھی اپنی تشریف آوری سے نوازتے تھے، انہیں دیکھ کر ہر شخص کو خوشی ہوتی تھی۔

پروفیسر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کی تصانیف بے شمار ہیں، اردو زبان و ادب ان کی اولین ترجیح تھی اس کے علاوہ بھی کئی اور زبانوں میں لکھتے تھے۔ ایک مقامی کالج میں ابتدا میں انگریزی پڑھاتے رہے پھر کشمیر یونیورسٹی میں درس و تدریس کے ساتھ وابستہ

ہو گئے۔ کافی عرصے تک صدرِ شعبہ اردو رہے بعد میں اسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ یہ وہ دور تھا جو انتہائی نازک اور افراتفری کا تھا۔ ملازمت سے سنیاس لے کر علمی اور ادبی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور آخری دم تک اسی میں لگے رہے۔

کئی افسانوی مجموعے، ناول، تحقیقی اور تنقیدی کتابیں چھوڑ کر گئے ہیں۔ شعری مجموعوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے کیونکہ شاعری سے بے حد لگاؤ تھا خاص طور پر صنفِ غزل کے ساتھ جنون کی حد تک محبت تھی۔ غزل ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی اور انہوں نے بھی اس کے اسرار و رموز سے مکمل آگاہی حاصل کر لی تھی، غالباً یہ بھی ایک وجہ تھی کہ مرحوم عمر کے اس پڑاؤ پر بھی رسائل و جرائد میں اہتمام کے ساتھ اپنی تازہ غزلیں چھپوایا کرتے تھے۔ گو کہ اردو نظم پر بھی بہت کام کر چکے ہیں۔

حامدی صاحب نے لاتعداد سمینار کروائے، اور خود بھی ملکی اور غیر ملکی سمیناروں میں شریک ہوتے رہے۔ جدید اردو شاعری، میر، غالب، اقبال، پریم چند، ناصر کاظمی، کرشن چندر اور دیگر معروف و قد آور قلمکاروں پر خصوصیت کے ساتھ اپنے انفراد و اختصاص کے ساتھ قلم اٹھایا۔ لاتعداد قابل اور ہونہار شاگرد پیدا کئے اور اکتشافی تنقید کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کی گونج آج ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ ان کی شریکِ حیات محترمہ مصرہ مریم بھی خود اردو زبان کے درس و تدریس کے ساتھ وابستہ رہ چکی ہیں اور خود ایک اردو ادیبہ اور کئی فکر انگیز کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ پروفیسر صاحب مرحوم کی طویل علالت اور ضعف کی وجہ سے محترمہ مصرہ مریم ہی ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں اور خوب ساتھ نبھاتی تھیں۔ حامدی صاحب کے بارے میں ان کے تاثرات ہیں کہ مرحوم کی گفتگو شگفتہ تھی، طبیعت میں مزاح تھا، موڈ اچھا ہوتا تو گھر میں یار دوستوں کی محفل میں خوب بلند آہنگ قہقہے لگاتے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا سنجیدہ کام کرنے کے بعد گھر بھر کو ہنسانا ان کا کام تھا۔

محترمہ مصرہ مریم لکھتی ہیں کہ حامدی مرحوم کو نیند بہت پیاری تھی۔ جلدی سونے اور صبح سویرے اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز ادا کرنے کے بعد سب سے پہلے شیو بنانا اور روز نہانا مرحوم کے معمولات میں شامل تھا۔ ناشتہ سے فراغت کے بعد اکثر لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح شام کو بھی یک سوئی کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ لکھنے سے فراغت کے لمحات میں بچوں کے ساتھ وقت گذارنا، ٹی وی دیکھنا، ریڈیو سننا، ڈاک دیکھنا، اور دیگر چھوٹے بڑے معاملات میں دلچسپی لینا ان کا معمول تھا۔ اپنا کام خود ہی انجام دینے کے عادی تھے۔ کتابیں اور رسائل سلیقے سے رکھنا، اپنے کپڑے خود پریس کرنا اور اپنے جوتوں کی خود پالش کرنا۔ بستر لگانا، ہر روز ٹہلنے کے لئے جانا۔ اپنے روزمرہ معمولات میں کسی تبدیلی کے روادار نہیں تھے اگر اس سے ہٹ کر کچھ کرنا پڑتا تھا تو جھنجھلاہٹ سی محسوس کرتے تھے۔

محترمہ مصرہ مریم صاحبہ مزید لکھتی ہیں کہ حامدی مرحوم باتیں کم کرتے تھے۔ بلاضرورت لب کشائی نہیں کرتے تھے اور جب بات کرتے تھے تو آہستگی سے ٹھہر ٹھہر کر بولتے تھے۔ دورانِ گفتگو مخاطب یا سامع کا خوب خیال رکھتے تھے۔ یہ نہیں کہ دوسروں کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیں دوسروں کے نقطۂ نظر کا احترام کرنا ان کے خمیر میں تھا، اپنا نظریہ درست ثابت کرنے اور اپنی بات منوانے کے لئے استدلال اور ثبوت و شواہد کا خوب سہارا لیتے تھے۔ اپنی بات منوانے کے لئے کبھی کبھار اگر لہجے میں تیزی بھی آجاتی تھی تو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس بھی ہو جاتا تھا اور مسکراتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیتے تھے۔

لباس میں حد درجہ نفاست پسندی کے قائل تھے۔ لباس صاف، پریس کیا ہوا ہو، سفید اور ہلکے نیلے رنگ کا پسند کرتے تھے، سفید قمیض، لکھنے کے لئے سفید کاغذ، سفید تکیہ (اور اب سفید کفن بھی) پسند تھا، گھر میں کرتا پاجامہ اور خان ڈریس اور باہر کوٹ پتلون۔ سردی کے موسم میں گھر اور باہر قراقلی ٹوپی پہنتے تھے البتہ شدید سردی میں بھی عام کشمیریوں کا پہناوا 'پھرن' کو نہیں پہنتے تھے کہ اسے باعثِ سستی مانتے تھے۔ گھومنا پھرنا پسند تھا لیکن اب پچھلے آٹھ دس برسوں سے خانہ نشینی پسند تھی، گھر کے گوشۂ خلوت میں ہی آسودۂ خاطر رہتے تھے۔

شاعری سے ان کی وابستگی دیوانگی کی حد تک تھی۔ شعر گوئی پر طبیعت مائل و آمادہ ہو جاتی تھی تو ان کی بے چینی اور اضطراب میں شدت پیدا ہو جاتی تھی اور عمر کے آخری ایام میں ہر لحہ فکرِ شعر میں گزرتا تھا۔ مرحوم کی شعری یا شاعرانہ کیفیت مجنونانہ اور مجذوبانہ ہوتی تھی، چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آتے تھے۔ تخلیق شعر کے دوران ان پر ایک خاص قسم کی اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ یہ اندازہ لگ جاتا تھا کہ تخلیقیت کے آتش و نور میں گھر گئے ہیں اور اس صورتِ حال کے بعد اشعار پھوار کی طرح نازل ہونا شروع ہو جاتے تھے، اس کے بعد چہرے پر ایک خاص قسم کی بشاشت اور رونق و تازگی آجاتی تھی اور قلم کاغذ ہاتھ میں لے کر اشعار تحریر کرتے رہتے تھے۔ یہ کیفیتِ شعر ایک دو غزلوں پر منتج ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی یہ خاص کیفیت مہینہ بھر یا اس سے زیادہ عرصہ تک بھی قائم رہتی تھی اور غزلوں پر غزلیں سامنے آجاتی تھیں۔

پیڑ پودے، پتے، سبزہ، کلیاں، کونپلیں، پھول، پھل، جھرنے، ندیاں، دریا، جھیل، نیلا آسمان، افق، ستارے، ماہتاب، کیاریاں شادابی، خوش نوا پرندے، مخملی گھاس، سرسبز کوہ و دمن، لہلہاتے ہوئے کھیت و کھلیان، رنگ برنگ پرندے اور جنگلوں میں ان کی گونجتی ہوئی مسحور کن آوازیں، بادِ صرصر اور نغمہ ریز ہوائیں، خاموش وادیاں، سرتاپا برف کی چادر اوڑھے ہوئے ڈھلوان، خوبصورت اور سیدھے سادے دیہاتی لوگ، غرض چپے چپے پر پھیلی ہوئی، کشمیر کی اسی فطری خوبصورتی اور حسن کے حامدی کاشمیری دلدادہ اور دیوانہ تھے اور یہی سب کچھ ان کی شاعری میں نظر آتا ہے اور ان کی تخلیقات کے عناصرِ فطرت و جمالیات ہیں گو کہ ان کا دل بحیثیت مجموعی دنیا میں رونما ہونے والے انسانیت سوز حالات و واقعات، خاص طور پر ہم وطنوں کے دکھ درد سے بھی رنجیدہ خاطر تھا جس کا عکس ان کی تخلیقات، نثر و نظم دونوں میں جا بجا نظر آتا ہے جو ایک لازمی امر بھی ہے۔

حامدی صاحب مشاعرہ بازی سے بے زار رہتے تھے اور بہت کم مشاعروں میں، مدعو ہونے کے باوجود بھی شرکت کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ جب غالباً اسی کی دہائی میں یہاں مرحوم زبیر رضوی صاحب ڈپٹی یا اسسٹنٹ ڈائریکٹر ریڈیو کشمیر تھے انہوں نے احقر کو یووا وانی میں پہلی بار مشاعرے میں مدعو کیا تھا اور میں نے وہاں ایک غزل پڑھی تھی جو میں نے حامدی مرحوم کی ہی نذر کی تھی۔

پروفیسر حامدی کاشمیری مرحوم نام و نمود اور دکھاوے سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ شہرت طلبی ان کے پاس پڑوس میں نظر آنے والے لوگوں کے ایمان کا جز نظر آتی تھی اور ہے بھی، خاص طور پر ادیبوں اور شاعروں میں یہ جذبہ بدرجہ اتم موجود رہتا ہے لیکن

حصولِ شہرت کی طرف، ان کی طبیعت مائل نہ تھی جو خود بخود ان کی قابلیت اور ایمانداری کی وجہ سے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتی تھی۔ سراپا عجز وانکساری کا نمونہ تھے، اتنی کتابوں کے مصنف ہونے کے باوجود بھی طبیعت میں ذرا سی خودسری نہ تھی۔ نہ کسی سماجی، معاشی یا معاشرتی برتری یا فضیلت کا ہی کوئی خیال یا فروتری کا ہی احساس تھا۔ ادیبوں، شاعروں کے ساتھ اچھے تعلقات تھے نئی نسل سے تعلق رکھنے والے قلمکاروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی اور طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کی تربیت، معاونت واصلاح، خندہ پیشانی سے کرتے تھے۔ معروف افسانہ نگار جوگندر پال اپنے مضمون میں مرحوم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''حامدی کاشمیری کو دیکھ کر بے اختیار کشمیر کے پہاڑوں کا خیال آنے لگتا ہے۔ خاموش، عمودی، وابستہ، زرخیز، اسلئے جب کبھی وہ میدانوں میں آنکلتا ہے تو ان کے لئے سب انسان ہیں اور کوئی بھی انسان کم تر نہیں ہے۔ اس لئے وہ ہر ایک سے انسانی سطح پر ملتے ہیں۔ غرور اور تکبر انہیں چھو کر نہیں گیا ہے، اپنے سے کم تر لوگوں کے لئے سراپا عجز وانکسار رہتے ہیں اور ان کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ان کی پاک باطنی اور خوش اطواری کے سب مداح ہیں۔ میں نے انہیں کبھی کسی عادتِ قبیحہ مثلاً عیب جوئی، بدگوئی، غیبت یا خودستائی میں ملوث نہیں پایا۔''

یا پھر برج پریمی کے یہ الفاظ کہ

''میں نے حامدی کاشمیری کو اپنا دوست، فلسفی اور رہنما پایا، مشکلات میں اپنے نرم و نازک لہجے سے زخموں پر پھاہا رکھنے والا دوست، اپنے تخلیقی تجربوں میں شریک کرتے وقت گمبھیر فلسفی اور تاریک راہوں میں سمت دکھاتے وقت رہنما۔''

ان کی شریک حیات محترمہ مصرّہ مریم لکھتی ہیں کہ اگر مرحوم کو کوئی exploit کرنے کی کوشش کرتا تو آگ بگولہ ہو جاتے تھے۔ بچوں کو نصیحت کرتے تھے کہ کبھی کسی کو استحصال کی اجازت نہیں دینی چاہئے۔ کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتے کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ یا پھر احساسِ شرمندگی ہو۔ سچے اور کھرے انسان تھے۔ حق گوئی اور حق پرستی ان کا شعار تھا، جھوٹ سے نفرت تھی اسلئے کبھی نہیں بولتے۔ ان کے خیال میں انسان کی طبیعت میں شر اور فساد ہے ایذا رسانی انسان کی عادت ہے اور لوگ جو اپنے اوپر قابو نہیں رکھتے اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہیں۔ حامدی کاشمیری کو جو بات یا جو اوصاف کشمیر یونیورسٹی کے اپنے اکثر ہم پیشہ اور ہم عصر رفقائے کار سے ممتاز وممیّز بناتے تھے وہ ان کی نیک نامی، صاف وشفاف باطن، اور بے داغ کردار ہے۔ انتہائی بدقسمتی سے یہاں یہ بات لکھنی پڑ رہی ہے ان میں اکثر اچھے کردار کے مالک نہ تھے، آج جن ادبی اور علمی تقاریب کی ایوان صدارت میں لازماً براجمان کردئے جاتے ہیں وہ کسی بھی لحاظ سے اس کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کا کردار انتہائی گھناؤنا رہ چکا ہے اور ان کے واقف کاروں کو ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر گھن آنے لگتی ہے کہ اپنی اولاد جیسے طلبہ کا تقدس پائمال کرنے کے مرتکب رہ چکے ہیں جو انسانی سماج میں ایک انتہائی قابلِ نفرت فعل ہے ایسے مردہ ضمیر اشخاص کو پروفیسر حامدی جیسے صاف باطن لوگ بہت کم برداشت ہوتے ہیں۔ جو یونیورسٹی جسے دانش گاہ کا نام بھی دیا جاتا ہے، کے تقدس سے پوری طرح سے واقف تھے اور ایک استاذ اور شاگرد کے رشتے کے تقدس سے پوری طرح سے آشنا اور سختی سے قائل بھی تھے۔

پروفیسر مرحوم زندگی، موت، انسانی رشتوں اور فطرت کے بارے میں صوفیانہ مزاج رکھتے تھے۔ یہ بات وہ کبھی نہیں بھولتے تھے کہ زندگی دو روزہ ہے اور موت اٹل ہے، موت کے اس ہمہ وقتی احساس نے ہی ان میں دردمندی، لاتعلقی، کسر نفسی اور دوسروں کے معاملات میں عدم مداخلت کا درس دیا تھا اور رویہ پیدا کیا تھا۔ غالباً اسی لئے کسی روحانی بزرگ نے انہیں ایک ایسا 'درویش' کہا تھا جو کسی دن گوشۂ نشین ہو جائے گا' اب یہ طے کرنا باقی ہے کہ پروفیسر حبیب اللہ حامدی مرحوم بحیثیت کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اس وقت کے ہنگامہ خیز دور سے گزرنے کے بعد، اپنے عہدے سے دست بردار ہو کر ہی، عملی طور پر گوشہ نشین ہو گئے تھے یا پھر دسمبر 2018 کی ہواؤں سے لاتعلق ہو کر گوشہ نشین ہو گئے ہیں؟ اللہ مغفرت کرے کیا خوب آدمی تھے۔

☆☆☆


ترقیاتی ماہنامہ **یوجنا** نئی دہلی

(ایڈیٹر: ڈاکٹر ابرار رحمانی)

دسمبر 2018 کا شمارہ **ڈیجیٹل انڈیا**

منظر عام پر

**جنوری 2019 کا شمارہ**

**ایجادات واختراع**

**فروری 2019 کا شمارہ**

**بنیادی ڈھانچہ**

پر خاص ہوگا

مضامین ارسال کرنے کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) E-601، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس نئی دہلی-110003

yojanaurdu.com@gmail.com

قیمت: فی شمارہ 22 روپے، سالانہ 230 روپے

دوسال کے لیے 430 روپے، تین سال کے لیے

610 روپے

قارئین اپنی کاپیاں پیشگی بک کرالیں۔ ایجنٹ اور خریدار اپنا آرڈر دیتے وقت

**یوجنا** (اردو) ضرور لکھیں

**چندہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا بینک ڈرافٹ سے ارسال کرسکتے ہیں**

**سالانہ چندہ اور خریداری کے لئے مندرجہ ذیل پتہ پر رابطہ قائم کریں:**

**پتہ**: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس نئی دہلی-110003

فون: **011-24367260**

عبدالصمد

# ادب کا چنار

**2018** نے چرکے تو بہت دئے مگر جاتے جاتے اس نے جو ماسٹراسٹروک مارا، اس کا درد تو شاید بہت لمبے عرصے تک ان لوگوں کو بلبلاتا رہے گا جو پروفیسر حامدی کاشمیری کو بہت قریب سے جانتے ہیں۔وہ ایسی شخصیت کے حامل ہرگز نہیں تھے جنہیں کبھی بھلایا جاسکے۔کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد متوفی کے صرف اوصاف بیان کئے جاتے ہیں، حامدی کاشمیری کے اندر تو ایسے صفات اور ایسی خوبیاں تھیں جو ان کی زندگی میں بھی یاد آتی تھیں اور ان کی موت کے بعد تو یاد آنا اب مقدر بن چکا ہے۔ڈھونڈنے سے بھی ان کے اندر کوئی خامی یاد نہیں آتی۔

حامدی کاشمیری فکشن نگار تھے، شاعر تھے، تنقید نگار تھے، محقق تھے اور ان سب میدانوں کے مرد میدان.....انہیں ایک ایسا تخلیقی ذہن ودیعت ہوا تھا جو آخر آخر تک فعال رہا، انہوں نے نسبتاً ایک لمبی عمر پائی اور فطری طور پر ان کے قویٰ مضمحل ہوگئے تھے، مگر ذہن ہمیشہ تروتازہ رہا۔ان کی ادبی صلاحیتوں پر اظہار خیال کرنے کا حق تو صرف انہیں حاصل ہے جو اس کے اہل ہیں، میں تو اس وقت ان کی ذات کی ان خوبیوں کو یاد کرنے بیٹھا ہوں جو چالیس برسوں کے تعلقات پر محیط ہیں اور ماسٹراسٹروک کے نتیجے میں اچانک ابھر کے سامنے آگئی ہیں۔سوچ سوچ کے تعجب ہوتا ہے کہ خاک کے پردے سے کوئی ایسا وجود بھی سچ مچ نکل سکتا ہے جو حامدی کاشمیری کی صورت ہمارے سامنے ایک عام انسان کی طرح چلتا پھرتا رہا، جس کے جانے کے بعد شدت سے محسوس ہو رہا ہے کہ شاید وہ انسان سے الگ بھی کوئی شے تھا۔

طویل عرصے کے تعلقات کے نتیجے میں حامدی کاشمیری ایک نہایت مخلص دوست، ایمان دار، بے ریا، صحیح اور راست مشورہ دینے والے ہمدرد انسان کی صورت ابھرے۔میں نے ان کی زبان سے کسی کی برائی نہیں سنی، کسی کی غیبت نہیں سنی، دراصل ان کی نگاہیں دوستوں اور جاننے والوں کی کمزوریوں پر پڑتی ہی نہیں تھیں، وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ان کے اندر خوبیاں نکال لیتے۔ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ان کے دشمنوں کی تعداد کچھ کم تھی، مگر معاملہ یہ تھا کہ ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہوتی تھی، دوسروں کو ان سے دشمنی ہو جاتی۔حامدی کاشمیری نے ادب، سماج اور زندگی کے مختلف میدانوں میں ترقی کے جو مدارج طے کئے، ان کے سبب دشمنوں کا ایک حلقہ بن جانا بالکل فطری تھا مگر بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو دشمنوں کے نرغے سے بچتا بچاتا، انہیں بغیر کوئی نقصان پہنچائے بخیر وخوبی نکل آئے۔اس حسن ترکیب سے دشمنوں پر جو چوٹ پہنچتی ہے وہ ایک عرصہ دراز تک ان کے زخموں کو سہلانے پر مجبور کرتی ہے۔حامدی کاشمیری کے اندر ایک افسانوی صفت تھی۔وہ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اس سے خوب خوب لطف اندوز ہوتے۔مجھے یاد ہے ان کی ایک یادگار تصنیف ''اکتشافی تنقید'' پر ایک رسالے نے مضحکہ خیز تبصرہ کیا تھا۔حامدی صاحب نے پڑھا تو اس پر دل کھول کر ہنسے بلکہ ہنستے ہی رہے۔

ایسے انسان خال خال پائے جاتے ہیں جو دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنے اور پرایا غم کو اپنانے میں ہرگز نہیں جھجکتے۔ادب کی دنیا میں تو یہ چیز تقریباً عنقا ہی ہے۔یہاں تو معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کی خوشی پر ہونٹوں پر مکاری سے پُرمسکراہٹ ہے، جبکہ دل میں آگ سے اپنا ہی باطن جل رہا ہے۔منافقت نے اس طرح سب کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا ہے کہ اب یہی ادب کی پہچان بنتی جارہی ہے۔حامدی صاحب دوسروں کی خوشی کو نہ صرف اپنی سمجھتے بلکہ وہ اس میں بڑھ چڑھ کے شریک ہوتے۔ساہتیہ اکیڈمی میں پانچ سالوں (۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۷ء) تک ان کے ساتھ میرا گہرا رشتہ رہا، جس طرح انہوں نے میری رہنمائی فرمائی، قدم قدم پر مجھے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، وہ میری یادوں میں ہمیشہ نقش رہے گا۔ساہتیہ اکیڈمی کے اردو بورڈ کا کنوینر انہیں ہی ہونا تھا، مگر انہوں نے عین موقع پر میرے نام کی تجویز کردی، جس سے سب لوگ ہکا بکا رہ گئے۔میں تو ذہنی طور پر تیار بھی نہیں تھا۔پھر میں حکومت بہار میں ایک ذمہ دار اور مصروف عہدے پر بھی تھا، مگر ان کے سامنے میری ایک نہ چلی۔میرے نام کو آگے بڑھا کے وہ یوں خوش تھے کہ اپنے بننے پر بھی شاید اتنے خوش نہ ہوتے۔

حامدی صاحب اپنی بات چیت، لب ولہجہ، انداز بیان اور اظہار خیال کے معاملے میں بے حد محتاط شخصیت کے مالک تھے۔کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ کبھی انہوں نے اپنی کسی بات سے کسی کو ذہنی اور قلبی تکلیف پہنچائی ہو۔وہ ہر قسم کے تنازعہ سے دور رہتے۔کچھ لوگوں کو تنازعہ میں رہنے کا خواہ مخواہ شوق ہوتا ہے، محض اس لئے کہ بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ایسے لوگوں کو کسی کا غیر جانبداری یا تنازعہ سے دور رہنا بہت کھلتا ہے۔حامدی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ایک لکھنے پڑھنے والے آدمی کو صرف اور صرف اپنے لکھنے پڑھنے پر اپنا دھیان مرکوز رکھنا چاہئے، خواہ مخواہ کے تنازعہ میں پڑنے یا بے جا بحث ومباحث میں پڑنے سے وقت تو ضائع ہوتا ہی ہے تخلیقی ذہن بھی متاثر ہوتا ہے۔

حامدی صاحب تواضع اور انکسار کی ایک اعلیٰ ترین مثال تھے۔ادب کی دنیا میں ایک ممتاز اور مخصوص مقام کے حامل ہونے کے علاوہ وہ دنیاوی سطح پر بے حد اہم عہدوں پر فائز رہے۔مگر کوئی بھی عہدہ یا مقام ان کے سر پر نہیں چڑھا۔وہ ہمیشہ وہی رہے جو بنیادی طور پر تھے.....حامدی کاشمیری۔اصل میں انہیں اپنی ہی پہچان بے حد محبوب تھی۔اسی مزاج نے انہیں وہ محبوبیت عطا کی جو لوگوں کو ہزار سر پیر مارنے اور بہت تگ ودو کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔اگر ہوتی بھی ہے تو وقتی۔اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔حامدی صاحب عالم بے مثل تھے، مگر اپنے انداز واطوار سے انہوں نے اپنی خصوصیت کی نمائش کرنے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔البتہ جب وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے تب ان کی علمی گہرائی کا اندازہ ہوتا۔وہ اپنے مخاطب پر دھونس جمانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے اور شعوری طور پر اس کی کوشش کرتے کہ کوئی کم علم مخاطب احساس کمتری میں مبتلا نہ ہو، بلکہ بسا اوقات ان سے گفتگو کے بعد احساس کمتری خود ہی دور رہنے میں عافیت سمجھتی۔حامدی صاحب کبھی کسی کی ہمت شکنی نہیں کرتے تھے۔دوسروں کی ہمت افزائی کرنا بھی ان کی ایک خصوصیت تھی جس سے ہم جیسے کم سواد لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ان معنوں میں فائدہ کہ اچھا برا جو بھی لکھا اسے اپنا ہی سمجھا اور اسی پر قانع ہوئے۔

حامدی صاحب اگرچہ اردو کے مروجہ مراکز سے دور رہتے تھے مگر وہ ان مراکز کی تقریباً سبھی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں ذہنی اور روحانی طور پر شریک رہتے۔جب تک صحت قابل رشک تھی انہوں نے دور دراز کے سفر ذوق وشوق سے کئے، ادھر بیماریوں اور جسمانی کمزوریوں کے باعث ان کے سفر کرنے کی رفتار کم ہوگئی تھی، مگر انہوں نے اپنی شخصیت کی اس طرح تشکیل کی تھی کہ غیر موجود ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ ان کی موجودگی محسوس ہوتی۔جن لوگوں سے انہوں نے جا و بے جا محبت کی اور جو لوگ کسی نہ کسی سطح پر ان سے قریب رہے، ان سے ان کا رابطہ ہمیشہ بنا رہتا۔حامدی صاحب مزاجاً کم آمیز تھے مگر ان کی کم آمیزی کبھی کسی کو محسوس نہیں ہوتی تھی۔ان کی زبان یا قلم سے جو مختصر الفاظ برآمد ہوتے وہ اکثر کئی کئی صفحات پر بھاری ہوتے۔ان کے سیدھے سادے جملے اتنے اثر انگیز ہوتے کہ تیر بہ ہدف کا اثر رکھتے۔

ہم جیسے لوگوں کے لئے کشمیر کی پہچان حامدی صاحب سے تھی اور حامدی صاحب نے بھی اپنی پہچان کشمیر ہی سے بنائے رکھی۔کشمیر میں آج بھی چنار خوب پھلتا پھولتا ہے، مگر ادب کا چنار مرجھا گیا۔

☆☆

212 A، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ-800010
فون:09304999098 mrrizvi1965@gmail.com

# غزلیں

## غالب کی زمین میں

### پروفیسر مظفر حنفی

روز اک روپ نیا میرا دکھاتا ہے مجھے
قطرہ قطرہ کوئی لمحوں میں جلاتا ہے مجھے

راکھ کا ڈھیر ہوں میں کون تڑپ کر مجھ میں
جگمگاتا ہے مجھے، آگ بناتا ہے مجھے

گم رہی میری جبلت ، مری فطرت گردش
راستہ راہ کا پتھر نظرآتا ہے مجھے

مجھ کو ہونے کا یہ احساس نہ جینے دے گا
سوئی کی نوک پہ ہر سمت گھماتا ہے مجھے

اپنی نظروں سے گراتا ہے مجھے کرب وجود
پھر بگولے کی طرح سر پہ چڑھاتا ہے مجھے

میں کہ پامال ہوں اک نقش کفِ پا کی طرح
بیٹھ جاؤں گا کہیں، کون اٹھاتا ہے مجھے

تم نے چوٹی پہ قدم اپنے جما رکھے ہیں
میں بھی مجبور ہوں جھرنا لیے جاتا ہے مجھے

D-40، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔25
فون:09911067200

### ایم قمرالدین

ہوں خود کو اک المیے کا عنواں کیے ہوئے
اوراس کو اپنی شکل پہ چسپاں کیے ہوئے
عرصہ ہوا ہے، کچھ بھی نہیں ہوسکا فروخت
عرصہ ہوا ہے قیمتیں ارزاں کیے ہوئے
ہے اس کے فائدے سے بہت، فائدہ مرا
ہو فائدے میں وہ، مرا نقصاں کیے ہوئے
تقریراس کی خوب ہے ، تحریر خوب تر
یعنی غلط صحیح کو یکساں کیے ہوئے
اپنا سکون دیکھئے، رہتا ہے کتنی دیر!
بیٹھا ہوں اپنی مشکلیں، آساں کیے ہوئے
ترغیب دے کے خودکشی، کرتی ہے مجھ پہ طنز
کیا زندگی سے ہو کوئی پیماں کیے ہوئے؟
حیرانیوں کی ایک جہت، یہ بھی خوب ہے
حیراں ہوئے ہیں وہ، مجھے حیراں کیے ہوئے؟
اطراف میرے دانا ہی دانا ہے، اور میں
زندہ ہوں اپنے آپ کو ناداں کیے ہوئے
''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں''
جاتے ہیں میرے شعروں پہ افشاں کیے ہوئے

جناب ایم قمرالدین ایڈوکیٹ نے یہ غزل فروری کے شمارہ کے لیے بطور خاص ارسال کی تھی۔افسوس کہ 2 جنوری 2018 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

### شفیق احمد

نذر غالب

کب مع بال وپر نہیں آتی
فکر آشفتہ سر نہیں آتی

دے کے دستک اگر نہیں آتی
موت کرکے خبر نہیں آتی

گر کفن باندھ کر نہیں آتی
زندگی داؤ پر نہیں آتی

خون میں تربتر نہیں آتی
نعش سرحد سے گھر نہیں آتی

شب جدائی کی گر نہیں آتی
سرخوشی سربسر نہیں آتی

نظر اس کی ادھر نہیں آتی
جانے کیا جان کر نہیں آتی

وحشت دل ہو، یا جنوں لاحق
''موت آتی ہے پر نہیں آتی''

تتلی ارمان کی اڑے پیاسی
گل کی صورت نظر نہیں آتی

محنت شاقہ بغیر حیات
خوان پرلے کے زر نہیں آتی

زلف اس کی، کہ ہے شب یلدا!
جس کے پیچھے سحر نہیں آتی

یاد آتی ہے بس دبے پاؤں
کوئی آواز کر نہیں آتی

shafeeq1953@yahoo.com

# غزلیں

## مناظر حسن شاہیؔن

نہ تھک کے بیٹھ، رہِ جستجو میں پھول کھِلا
فضائے دشت میں،صحرائے ہُو میں پھول کھلا

تیری صدا پہ بہاروں کی رُت چلی آئی
وہ دیکھ! کشت غم آرزو میں پھول کھلا

حیات آفریں لمحوں کی عید ہوجائے
شراب آنکھ میں رکھ لے، سبو میں پھول کھلا

شمیم جاں سے مہک جائے وصل کی ساعت
کچھ اس ادا سے شب گفتگو میں پھول کھلا

حیات رقص کرے بھی ممات خوشبو دے
کمالِ ذوق نظر سے لہو میں پھول کھلا

یہ سچ ہے پہلے نہ تھی شاخ بندگی شاداب
مرے ہی اشکوں سے ظرف وضو میں پھول کھلا

بتا بھی کب تجھے حاصل تھی لحنِ داؤدی؟
مری غزل سے ہی شاخِ گلو میں پھول کھلا

دل حبیب کا تو سب خیال رکھتے ہیں
مزہ تو جب ہے کہ قلبِ عدُو میں پھول کھلا

حیات نام ہے جذبوں کی لب کشائی کا
فسردگی! تُو رگ آرزو میں پھول کھلا

رکے کہیں بھی نہ شاہیؔن روانی خوشبو
کچھ اس سلیقے سے تو آب جو میں پھول کھلا

مڈل اسکول لکشمی پور، وایا چاکند، گیا، (بہار)804404
فون:09661214111

## بدنام نظر

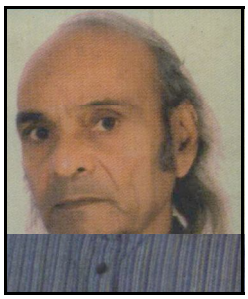



راکھ کے ڈھیر میں بھی شعلہ بیاں ایک سے ایک
ہاں مرے شہر میں ہیں اہل زباں ایک سے ایک

اک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی تم نے مجھ پر
دل خوش فہم میں ہے رقصِ گماں ایک سے ایک

پھولوں کے ہونٹ نہ چومے نہ کلی کو دیکھے
راہِ شبنم پہ تھا چکراتا دھواں ایک سے ایک

میں تہی دست تھا ہاتھوں پہ لکیریں بھی نہ تھیں
زندگی رکھتی گئی بارِ گراں ایک سے ایک

لوگ بھرتے رہے سونے سے تجوری گھر کی
اور ہم کرتے رہے کارِ زیاں ایک سے ایک

اب انہیں میری ضرورت نہیں شاید بدنام
بچے بُننے لگے اب اپنا جہاں ایک سے ایک

گاؤں کنڈہ، شیخ پورہ۔811105
فون:09661147635

## ڈاکٹر مقصود احمد انصاری

(مرزا غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ)

دل کی امید بر نہیں آتی
ان کی صورت نظر نہیں آتی

کر کے اغیار میں مجھے رسوا
شرم اے چشمِ تر نہیں آتی

اُف، یہ تاریکیاں، یہ تنہائی
رات کٹتی نظر نہیں آتی

شوقِ دیدار میں جو جاتی ہے
لوٹ کر وہ نظر نہیں آتی

دلِ ناداں کو کیسے بہلاؤں؟
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چاند پر چلمنوں کے پہرے ہیں
چاندنی بام پر نہیں آتی

عزم جب تک نہ ہوں جواں دل کے
طاقتِ بال و پر نہیں آتی

ان کے دل کی خبر خدا جانے
اپنے دل کی خبر نہیں آتی

رات جاتی نہیں ترے گھر تک
میرے گھر تک سحر نہیں آتی

ان کا آنا تو دور ہے مقصودؔ
یاد ان کی اب ادھر نہیں آتی

مسکن درگاہ منصور چک (بیگوسرائے) بہار۔851128
فون:09973739593

# غزلیں

## عمران عظیم

### یخ بستہ ہوائیں

عجب موسم ہے
یخ بستہ ہوائیں چل رہی ہیں
تن بدن کو ڈس رہی ہیں
گھروں کے بند دروازوں پہ
دستک دے رہی ہیں
ہلاتی ہیں دریچوں کے وہ پردے
روشنی کا منہ چڑاتی ہیں
بجھا کر طاقچوں کی گود میں رکھے چراغوں کو
چمن کے دشت کے بوڑھے شجر سہمے ہوئے ہیں
ہواؤں سے
جواں لوگوں میں لڑنے کا ہے یارا
پر دکھاتی ہیں انگوٹھا یہ
بڑے بوڑھوں کو بچوں کو
ستاتی ہیں
انہیں کرتی ہیں لرزاں
بج رہے ہیں دانت دانتوں سے
خدا جانے
ستائیں گی ہمیں کب تک
یہ آخر چاہتی ہیں کیا خراج آبادیوں سے؟
اے مرے مولا!

چیمبر 694، پٹیالہ ہاؤس کورٹ، نئی دہلی
فون:09312340686

## شاہد اختر

ہماری شامیں رہیں روز دربدر! افسوس
کبھی کھلا نہیں دروازۂ سحر ! افسوس
کوئی بھی کام سلیقے کا مجھ سے ہو نہ سکا
کہ میرے کام نہ آیا مرا ہنر! افسوس
نگار خانۂ حیرت کدہ کھلا ہے مگر
نظر نظر ہے تماشا، سفر سفر! افسوس
ہمارے اچھے برے چار دن گزر ہی گئے
تمام اپنا ہوا قصہ مختصر! افسوس
میں چاہ کر بھی تری سمت آ نہیں سکتا
بندھے ہوئے ہیں مری خواہشوں کے پر! افسوس
تمام عمر مجھے جس کی جستجو تھی بہت
وہ آئینہ بھی رہا خود سے بے خبر ! افسوس
ہمارے کان کبھی آج تک پڑی ہی نہیں
صدائیں گونج رہی ہیں اِدھر اُدھر! افسوس
سفر میں دھند سی چھائی تھی اس قدر اختر
نہ کوئی راستہ چمکا نہ رہگزر افسوس

گیا کالج، گیا بہار۔823001

## ثناءاللہ ثنا دوگھروی

انجمن سے اس کی کوئی اور کیا لے جائے گا
درد کا طوفان اک دل میں اٹھا لے جائے گا
سوچ لے کم ظرف کی صحبت سے پہلے سو طرح
وہ تمہارا عزو جاہ و مرتبہ لے جائے گا
ہر کوئی تیری شرافت کو لگے گا تولنے
گھر کے باہر گھر کا تو جب مسئلہ لے جائے گا
قابل صد رشک کر جائے گا اپنی زندگی
جو یہاں سے ساتھ میں حسنِ ادا لے جائے گا
روشنی میں بھی بھٹک جائے گا کوئی آدمی
اور منزل تک کسی کو نقش پا لے جائے گا
منزلیں طے اپنی کیجئے جلد کہ دست اجل
چھین کر قدموں سے اک دن راستہ لے جائے گا
آئیں گی رسوائیاں قاتل کے حصے میں مگر
خنجر قاتل لہو کا ذائقہ لے جائے گا
بے قصوروں کو ملے گی پھر سزا ناحق ثنا
پھر تعصب منصفوں کا فیصلہ لے جائے گا

سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
فون:08271577185

پروفیسر غضنفر

# خالی فریم

**دائر** وی کینوس پر تین فلک بوس ٹاور۔ کنارے کے دونوں ٹاوروں کے رنگ و روغن روشن۔ درمیانی ٹاور چمک دمک سے خالی۔ بے رنگ، بے نور۔

ہر ایک ٹاور کے سینے پر ایک بڑا سا فریم۔ روشن ٹاوروں کے فریموں میں تصویریں آویزاں۔ دائیں جانب کے فریم کی تصویر کے کئی ہاتھ۔ ہر ایک ہاتھ میں ایک آلۂ حرب: کسی میں تیر، کسی میں تفنگ، کسی میں تلوار، کسی میں بندوق، کسی میں بم، کسی میں بارود۔

بائیں طرف کی تصویر سر سے پا تک سیم وزر اور لعل و گہر سے مزین۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں انگوٹھیاں۔ انگوٹھیوں میں جڑے رنگ برنگ کے نگینے۔ نگینوں سے پھوٹتی ہوئی شعاعیں۔

بے رنگ اور بے رونق ٹاور کا فریم تصویر سے خالی۔

روشن ٹاوروں کے فریم کی تصویروں پر بہت ساری آنکھیں مرکوز۔ ان آنکھوں کی پتلیوں میں چاہ اور چمک۔

بے رنگ ٹاور کے خالی فریم کی طرف ایک بھی نگاہ مبذول نہیں۔

ٹاوروں کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کی سرسبز زمین پر جگہ جگہ لمبی چوڑی خاکستری پٹیاں۔ ادھر اُدھر بکھری ہوئی چھوٹی بڑی ہڈّیاں۔ کہیں کہیں پر جمے ہوئے سرخ مٹ میلے چکتّے۔ خاک و خون میں لتھڑے ہوئے لوتھڑے۔ جھیلوں اور تالابوں کے شفاف پانی سے نکلتے ہوئے شعلے۔ نیلگوں فضا میں اُڑتے ہوئے آتشیں گولے اور سیاہ مرغولے۔

ایک گوشے میں دخانی کھمبے پر سنہرے، روپہلے اور قرمزی تاروں سے بندھی ہوئی ایک تصویر جس کے ماتھے پر تیج اور آنکھوں میں جوت۔ تصویر کے پیروں کے نیچے ٹوٹا ہوا ایک ساز اور مرجھایا ہوا ایک گجرا۔

شائقین فن مصوری کی آنکھیں جزئیاتِ تصویر میں اور زبانیں تعبیر و تفسیر میں مشغول۔

''یار! یہ تیسرا فریم خالی کیوں ہے؟'' ایک نے اپنے پاس والے شخص کو مخاطب کیا۔

''ممکن ہے تصویر نکل گئی ہو؟'' دوسرے نے خالی فریم پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

''نکل گئی ہو یا نکال دی گئی ہو؟'' پہلے نے دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ایک ہی بات ہے۔'' مختصر سا جواب دے کر دوسرا پھر سے معائنے میں مصروف ہو گیا۔

''کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تصویر لگائی ہی نہ گئی ہو، میرا مطلب ہے کہ اس کے لیے تصویر بنی ہی نہ ہو؟''

''نہیں، یہ ممکن نہیں ہے۔ فریم بنا ہے تو تصویر بھی ضروری ہوگی اور فریم کی زمین بتا رہی ہے کہ تصویر لگی بھی ہوگی۔''

''تصویر پھر نکال کیوں دی گئی؟''

''ہاں، یہ سوال تو اٹھتا ہے مگر کیا یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ نکال دی گئی ہو؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ فریم سے نکل گئی ہو۔''

''مگر فریم سے کوئی تصویر اپنے آپ نکل سکتی ہے کیا؟''

''کیوں نہیں نکل سکتی؟''

''اس لیے کہ اپنے آپ کچھ نہیں ہوتا، کچھ ہونے کے پیچھے بھی کچھ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ ''کچھ'' کبھی کبھی دکھائی نہیں دیتا۔''

''ہاں یہ بھی صحیح ہے مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تصویر نکلی یا نکالی گئی بلکہ یہ ہے کہ تصویر فریم سے باہر کیوں ہوئی؟''

''ہاں، اصل مسئلہ تو یہی ہے۔''

''تو اس فریم سے تصویر کے باہر ہو جانے کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟''

اس سوال پر جب اس نے غور کرنا شروع کیا تو اس کی آنکھوں میں اس کے باغ کا گرا ہوا ایک پیڑ ابھر آیا۔ نہ کوئی آندھی چلی تھی، نہ ہی کسی نے اس کی جڑ پر کوئی کلہاڑا مارا تھا، پھر بھی ایک دن وہ پیڑ گر گیا۔ گھر اور پڑوس کے سبھی لوگ حیران تھے کہ ایسا کیوں ہوا کہ ایک سیانے نے ''کیوں'' کے اس کاٹنے کو ذہنوں سے نکال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس پیڑ کے پاس تھوڑے فاصلے پر جو دوسرا پیڑ کھڑا ہے اس کی جڑیں گرنے والے پیڑ کی جڑوں میں پہنچ کر موٹی ہونے لگی تھیں۔

''کیا سوچنے لگے۔ بتایا نہیں کیا سبب ہو سکتا ہے؟''

''شاید اس کا سبب دباؤ ہو سکتا ہے۔''

''کس کا دباؤ''

''اگل بغل کا دباؤ۔''

''مطلب''

''پہلو میں کھڑے ٹاوروں کی تصویروں کا دباؤ۔''

''کس طرح کا دباؤ؟''

اے۔12، بشریٰ حمزہ کالونی، لین اے، نیو سرسید نگر
ایکسٹینشن، علی گڑھ۔2 فون:09990237388
ghazanfarjmi@gmail.com

''چمک دمک کا دباؤ۔''

''دباؤ کی منطق؟''

''ایک کا عروج دوسرے کا زوال۔''

''یعنی؟''

''توجہی اور بے توجہی کی نفسیات۔ خود کو مرکزِ نگاہ میں رکھنے اور دوسرے کو دائرۂ نظر سے دور اور بے بساط کر دینے کی نفسیات۔

''اچھا! اور یہ ٹاور کیا ہیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ ٹاور ان تصویروں کی ماہیئت کے مظہر ہیں۔''

''اور تصویریں؟''

''ترجمان ہیں۔''

''کس شے کی ترجمان؟''

''اس شے کی جو زمین کو آسمان بنا دیتی ہے۔ پست کو بلند کر دیتی ہے اور جو قریب آجاتی ہے تو کوئی بھی دوری باقی نہیں رہتی۔''

''اور یہ آنکھیں جن کی پتلیاں تصویروں پر مرکوز ہیں؟''

''یہ شاید روشِ دوراں ہیں۔''

''روشِ دوراں؟''

''ہاں' روشِ دوراں جو بتاتی ہے کہ زمانہ کس سمت جا رہا ہے اور شاید اس بات کا اشارہ بھی کرتی ہیں کہ کدھر دیکھنا ہے اور کدھر نہیں دیکھنا ہے۔''

''یہ آتشیں گولے اور سیاہ مرغولے کیا ہیں؟''

''آلۂ کار۔''

''اور یہ ہڈیاں، خاستری پٹیاں، سرخ مٹ میلے دھبے، لوتھڑے اور پانی سے نکلنے والے شعلے؟''

''انجام''۔

''یہ بات تم وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''وثوق سے نہیں کہہ رہا ہوں، اندازہ لگا رہا ہوں۔''

''ان کا ان تصویروں سے کیا رشتہ ہے؟''

''شاید یہ کہ زمین کو آسمان بنانے والی شے زور و زر کے ساتھ شور و شر بھی برسا سکتی ہے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ روشن ٹاوروں والی تصویروں سے کیا اس تصویر کا بھی کوئی رشتہ ہے جو طرح طرح کے تاروں سے جکڑی ہوئی ہے اور جس کے پیروں کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا ساز پڑا ہے اور ایک مرجھایا ہوا گجرا بھی۔

''ہو سکتا ہے۔''

''کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟''

''یہ بتانا ابھی مشکل ہے۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سارے تار بھی علامات ہوں۔''

''ممکن ہے۔''

''یہ تار کس بات یا شے کی علامت ہو سکتے ہیں؟''

''اسی پر تو غور کرنا ہے، یہ جاننا ہے کہ یہ سنہرے، روپہلے اور قرمزی تار کس کس بات یا کس کس شے کی علامات ہیں۔ تصویر کو رسّی یا زنجیر میں بھی جکڑا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ ان کی جگہ مخصوص قسم کے تار استعمال کیے گئے۔ ضرور ان کی کوئی منطق بھی ہوگی۔''

''اور یہ منہ سے دھواں چھوڑتا ہوا کھمبا؟''

''ہاں، یہ بھی یوں ہی نہیں آیا ہوگا۔ اس کی بھی کوئی نہ کوئی معنویت ضرور ہوگی۔ اس پر بھی غور کرنا ہوگا۔''

''اور اس گجرے پر نہیں جو سر سے اتر کر پاؤں کے نیچے پڑا ہے؟''

''یقیناً اس پر بھی اور صرف اسی پر کیوں؟ اس ساز پر بھی جس کے تار ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔''

''ہاں، اس پر بھی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر یہ ساز سالم و ثابت ہوتا اور تصویر کے ہاتھ میں ہوتا تو کیا ہوتا؟''

''انگلیاں تاروں کو چھیڑتیں اور تاروں سے سُر نکلتا۔''

''کیسا سر؟''

''انتشار کو ہموار اور اضطراب کو پُرسکون کرنے والا سُر۔ ''تزکیۂ نفس والا سُر''، قلب کو اطمینان بخشنے والا سُر۔

''اور گجرا اپنی جگہ پر ہوتا اور اس کے پھول تازہ ہوتے تو کیا ہوتا؟''

''خوشبو نکلتی۔''

''کیسی خوشبو؟''

''مدمست کر دینے والی خوشبو، فکرِ دو عالم سے آزاد کر دینے والی خوشبو۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ یہی تصویر پہلے ——؟''

''ہو سکتا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو یہ وہاں کے بجائے یہاں کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ بے اثر اور بے ضرر ہو جائے۔ دوسرا سوال کیا تھا؟''

''اگر یہ وہاں ہوتی تو کیا ہوتا؟''

''جیسا کہ پوٹریٹ میں دکھائی دیتا ہے کہ اس تصویر کے ساتھ ساز بھی ہے اور ایک گجرا بھی۔ یعنی آواز اور خوشبو بھی۔ ممکن یہ دونوں اپنا رنگ و آہنگ دکھاتی ہوں جن سے دوسری تصویروں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہو، ان کی چمک دمک پر روک لگ جاتی ہو، نگاہ کے زاویے بدل جاتے ہوں۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہوگا؟''

''شاید اس لیے کہ ساز کی آواز میں صوتی کاٹ اور معنوی دھار بھی شامل ہوتی ہے۔''

''تو——''

''تو اس سے ممکن ہے کہ تیغ و تفنگ کا پانی اتر جاتا ہو۔ لعل و گوہر بے آب و تاب ہو جاتے ہوں اور خوشبو چوں کہ تن من کو مہکا دیتی ہے اور مہکا ہوا من اور معطر تن پرسکون ہوتا ہے لہٰذا کسی انتشار، خلفشار اور آزار کا باعث نہیں بنتا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے مگر روک۔ روک کا کیا فائدہ؟''

''روک اس لیے کہ آتشیں گولے اور سیاہ مرغولے نہ اڑیں۔''

''کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ جس طرح دیپک راگ سے شعلے بڑھک اٹھتے ہیں اسی طرح اس ساز و آواز سے بھڑکے ہوئے شعلے تھم جاتے ہوں گے۔''

''شاید ایسا ہی کچھ۔ تمھارا تیسرا سوال کیا تھا؟''

''یہاں یہ تصویر جکڑی ہوئی کیوں ہے؟''

''کسی کو باندھ کر کیوں رکھتے ہیں؟''

''تاکہ وہ ہاتھ پیر نہ چلا سکے۔ اپنی طاقت نہ دکھا سکے۔ اپنی اصل جگہ پر دوبارہ نہ جا سکے۔''

''تم نے بالکل صحیح کہا۔ یہ تصویر بھی شاید اسی لیے جکڑی گئی ہے کہ یہ دوبارہ اپنی جگہ پر نہ جا سکے۔ اپنی طاقت نہ دکھا سکے۔ اگر یہ فریم سے نکال کر یوں ہی چھوڑ دی جاتی تو ممکن ہے یہ کسی طرح دوبارہ اپنے فریم میں پہنچ جاتی یا کوئی اسے اٹھا کر پھر سے خالی فریم میں سجا دیتا اور اسے پھر سے اپنا جوہر دکھانے کا موقع مل جاتا۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تصویر وہاں سے نکلی

نہیں بلکہ نکالی گئی ہے؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے اور کیا سوال تھا تمہارا؟''

''یہ کہ اسے زنجیر یا رسّی کے بجائے تاروں سے کیوں جکڑا گیا ہے۔ وہ بھی مخصوص رنگ کے تاروں سے۔''

''مخصوص رنگ کے تار؟''

''ہاں روپہلے سنہرے اور قرمزی رنگ کے تار''

''روپہلے، سنہرے، قرمزی، روپہلے، سنہرے، قرمزی''—— کچھ دیر تک وہ ان تاروں کی گردان کرتا رہا۔ پھر یکا یک بول پڑا۔

''یار، کہیں یہ بھی روشِ دوراں کے مظاہر تو نہیں؟''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اندازے سے کہہ رہا ہوں، وثوق سے نہیں۔''

''یہ اندازہ کیوں؟''

''اس لیے کہ ان تاروں کے تار رفتارِ زمانہ سے لگّا کھاتے ہیں''

''ہوسکتا ہے تمہارا اندازہ صحیح ہو مگر یہ تار اب بھی میری گرفت سے باہر ہیں۔''

''گرفت میں تو پوری طرح میری بھی نہیں آسکے ہیں۔''

''ایک بات اور بتاؤ۔''

''پوچھو۔''

''یہ تصویر بھی تو کسی کی علامت ہوسکتی ہے؟''

کیوں نہیں، بہ شرطیکہ یہ وہاں رہی ہو۔''

''تو تمھیں اس کے وہاں ہونے میں کیا اب بھی شبہ ہے؟''

''شبہ تو ہونا ہی چاہیے کہ ہم قیاس کی بنیاد پر بات کررہے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم جو سمجھ رہے ہیں وہی سچ ہو۔ سچ کچھ اور بھی ہوسکتا ہے۔''

'اگر مان لو کہ ہمارا قیاس صحیح ہو تو ایسی صورت میں کیا یہ دھواں چھوڑنے والا کھمبا بھی بامعنی ہوسکتا ہے؟''

''یقیناً ہوسکتا ہے۔''

''تو اس پر بھی کچھ روشنی——''

''اس کے لیے تو اس کھمبے کے منہ سے نکلنے والے دھویں کے ہمراہ اڑنا پڑے گا۔''

''تو اُڑو۔''

''اڑیں گے مگر ابھی نہیں، ابھی تو بھاپ چھوڑنے والی چائے کی طلب محسوس ہورہی ہے۔ چلو کہیں چائے پیتے ہیں۔''

چلو میرا بھی سر دُکھنے لگا ہے۔''

دونوں نمائش گاہ سے نکل کر کینٹین میں پہنچ گئے۔ کینٹین میں زیادہ تر میزوں پر یہی پوٹریٹ زیر بحث تھا۔

''مصوّر نے اس میں کائنات کی ساری قوتیں یکجا کردی ہیں'' کسی میز سے آواز گونجی تھی۔

''پتہ نہیں یہ ٹاور کس لیے کھڑے کردیے گئے ہیں۔ بات تو تصویروں سے ہی پوری ہوجاتی ہے۔''

کسی دوسری میز سے یہ جملہ بلند ہوا تھا۔

''ارے یار! کچھ نہیں ہے، یہ محض چوں چوں کا مربّا ہے۔ کسی سے کسی کا کوئی ربط نہیں۔ سب کچھ بے تکا ہے۔ یہ ایک بے معنی پوٹریٹ ہے۔ بے کار میں ہم اپنا سر کھپا رہے ہیں۔'' یہ آواز کسی تیسرے گوشے سے آئی تھی۔

''کیا واقعی یہ بے معنی ہے؟''

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

''مجھے بے معنی تو نہیں لگتا۔''

''یعنی بامعنی لگتا ہے؟''

''ہاں، لگتا تو ہے مگر——''

''مگر کیا؟''

''معنی پوری طرح کھل نہیں پا رہا ہے؟''

معنی بھی کھل جائے گا مگر اتنی جلدی نہیں جتنی جلدی ہم چاہتے ہیں۔ مصور نے جسے بنانے میں برسوں لگائے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ منٹوں میں کھل جائے۔ آرٹ یوں نہیں کھلتا۔ اسے کھولنے کے لیے مصوّر ہی کی طرح محنت کرنی ہوتی ہے۔ پتلیوں کو پیڑا سے گزرنا پڑتا ہے۔ لکیروں سے لڑنا اور رنگوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کیسا لگا؟''

''اچھا لگا اور تمھیں؟''

''مجھے بھی اچھا لگا۔ اگر ہم معنی نہ ڈھونڈیں تب بھی یہ اچھا ہے کہ یہ اپنی طرف دل کو کھینچتا ہے۔ اس کے رنگ و روغن آنکھوں میں نور اور رگوں میں سرور بھرتے ہیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو، مگر تشنگی باقی رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ جلد سے جلد کھل جائے۔ اس کا معنی باہر نکل آئے۔ سب کچھ سامنے آجائے۔ سارا کچھ سمجھ میں آجائے۔ تمہاری سمجھ میں کچھ آیا؟''

''واضح طور پر تو نہیں، مبہم سی اتنی بات ضرور گرفت میں آئی ہے کہ شور و شر کو روکنے والا سر خود رُک گیا ہے۔ شاید اسے شکنجوں میں کس دیا گیا ہے اور جس کا تار اس فریم سے جڑتا ہے جو دو بھرے ہوئے فریموں کے درمیان خالی پڑا ہے۔

☆☆☆


ماہنامہ

**'آجکل'**

کا سالانہ چندہ

ماہنامہ 'آجکل' (اردو) کے

سالانہ چندہ کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

**سادہ ڈاک سے**

**رسالہ منگانے کے لیے**

| | |
|---|---|
| سالانہ | 230 روپے |
| دوسال کے لیے | 430 روپے |
| تین سال کے لیے | 610 روپے |

**رجسٹرڈ ڈاک سے**

**رسالہ منگانے کے لیے**

| | |
|---|---|
| سالانہ | 434 روپے |
| دوسال کے لیے | 838 روپے |
| تین سال کے لیے | 1222 روپے |

سالانہ چندے کی رقم بذریعہ پوسٹل آرڈر/ ڈیمانڈ ڈرافٹ بنام ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن قابل ادا، نئی دہلی ارسال کریں۔ آن لائن ادائیگی کے لیے ملاحظہ کریں ویب سائٹ۔

www.publicationsdivision.nic.in

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن

کمرہ نمبر 56، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس،

لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

فون نمبر:24365609----011-24367260

گلزار جاوید

# شیطان کی موت

**کسی** بھی شخص کی خوبیوں اور خامیوں کا اندازہ اس کے عمل سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کے اپنے اندر یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ وہ خود کو کسوٹی پر جانچے اور پرکھے۔ زندگی کے رویوں کے بارے میں اپنے اپروچ کو سچ، جھوٹ، اچھائی، برائی، نیکی، بدی کی ترازو میں تولے مگر چند ہی ساعتوں میں اس کے حوصلے پست اور ہمت جواب دے جاتی ہے اور وہ اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ گزرے ہوئے لمحات کا لمس اس کے انگ انگ میں آشکار ہونے لگتا ہے۔ کوشش کے باوجود فیصلہ کرنا بس میں نہیں رہتا۔

اس وقت اسکول کے زمانے کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے ہیں۔ ماسٹر حفیظ کا نورانی چہرہ اور کیکر کی ''بینت'' کے علاوہ اشفاق صاحب کے پیریڈ میں باجماعت مرغا بننے والے ایڈوکیٹ، ڈاکٹر، انجینئر، بیوروکریٹ، مدرس، صنعت کار کے طور پر کام کرنے والوں میں بچپن کے دوستوں کی شبیہیں نمایاں ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ یکا یک ٹیلی ویژن اسکرین پر اشتہاری فلم کی حسینہ نے نوعمری کے وہ قصے یاد دلائے ہیں جب صبح کہیں شام کہیں اور رات کہیں والی کیفیت طاری تھی۔ دل تھا کہ قابو میں نہ آتا تھا۔ کبھی چھت پر، کبھی گھر کے پچھواڑے، کبھی ویران گلی میں، کبھی ریسٹورینٹ، سینما، کلب یا کافی ہاؤس میں۔ کبھی چاندنی راتوں اور کبھی بھیگی برساتوں میں گھنٹوں محوِ گفتگو رہنا۔ آج ایک لفظ کہنا محال، تب سو طریقے حالِ دل عیاں کرنے کے۔ اب شعر و ادب سے بیزاری کی کیفیت۔ تب کسی کے لمس سے آشنا ہو کر قرطاس و قلم کا بے محابا استعمال!

خیالوں کا سلسلہ ایک بار پھر ٹوٹا، کانوں میں مسحور کن آواز نے پھر سے ٹیلی ویژن اسکرین کی جانب متوجہ کر دیا۔ کتنی نوخیز، حسین و دلکش ماں ہے جو گا گا کر بچے کو اپنے دودھ کی جگہ خشک پاؤڈر پانی میں ملا کر پلا رہی ہے اور اسے ماں کے دودھ کے قریب تر بتلا رہی ہے۔ اتنا بڑا دھوکا اس شیر خوار کے ساتھ کوئی غیر نہیں اس کی اپنی ماں کر رہی ہے!۔

خدا معلوم کس دل سے میری ماں شیر خواری میں مجھے چھوڑ کر، میرے باپ سے طلاق لے کر گوروں کے دیس چلی گئی اور میرے باپ نے اسی خشک دودھ کے بل بوتے پر مجھے کڑیل جوان بنا ڈالا..... ہاں مگر یاد آیا! بقول دادی ماں کے، ماں کی موجودگی میں بھی میری خوراک یہی درآمدی خشک دودھ تھا۔ یورپ میں پروان چڑھی میری ماں کو اپنی خوبصورتی کا بڑا خیال تھا۔ اسی ڈر سے اس نے اکلوتے بیٹے کو اپنی چھاتی سے بہنے والے دودھ کے ایک قطرہ کا بھی حق دار نہ جانا۔

میرا باپ چستی پھرتی کے علاوہ چہرے کی رنگت کا بڑا قائل تھا۔ نوجوان چہروں پر شگفتگی اور شادابی اس کے نزدیک صحت مندی کا سائن بورڈ تھا۔ بقول اس کے جس کمپنی کا سائن بورڈ بھدّا اور بے جان ہو اس کی پروڈکٹ سے بہتری کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ اسی غرض سے وہ میرے سونے، جاگنے، کھانے، پینے، ورزش اور روزمرہ کیلریز کا باقاعدہ حساب رکھتا۔ میری صحت سے متعلق اپنے باپ کی فکرمندی میری سمجھ سے بالا تھی۔ کیونکہ وہ میرے لئے مفید کم مضر زیادہ ثابت ہو رہی تھی۔ بہتر نشو ونما کے ساتھ سرکشی اور بے باکی بھی پروان چڑھ رہی تھی۔ ابھرتی جوانی، دلکش نین نقش، مناسب قد کاٹھ، گھنی اور سیاہ زلفیں، گرد و پیش کی حسیناؤں کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی تھے۔ آنے والا ہر دن نئی کہانی کا موجب بننے لگا۔ رسوائیاں عام ہونے لگیں۔ رائی کا پہاڑ بنانے والوں کی مرادیں بر آئیں۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ بے چینی بے قراری اور اضطراب رنگ دکھلانے لگا۔ نئے تعلق بننے اور پرانے ٹوٹنے لگے۔ اطمینان کسی طور نصیب نہ تھا۔ گوہر مقصود ہاتھ نہ آتا یا آ کر نکل جاتا۔ کسی کی بانہوں میں ڈوب جانے .....غرق ہو جانے کو جی مچل مچل جاتا۔ کوئی پیمانہ، کوئی معیار، عشق کی کوئی انتہا نہ تھی۔ نوعمر، نوخیز حسیناؤں سے دل اچاٹ ہو رہا تھا۔ متناسب جسم اپنی جانب متوجہ کرنے لگے تھے۔ یہی شوق اشتیاق پارٹی میں جا بجا بکھرے نوخیز جلوؤں کو چھوڑ کر چالیس کے پیٹے میں پہنچی حسینہ، صادقہ کے گرد کھینچ کر لے گیا۔

اس کا سراپا، اس کے مزاج کی سادگی، سلیقہ مندی اور حسن پسندی کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پارٹی میں شامل ہوتے ہوئے بھی سب سے الگ منفرد اور باوقار نظر آرہی تھی۔ کٹورا سی اداس آنکھیں، کاجل کی آمیزش کے بعد اس جھیل کا منظر پیش کر رہی تھیں جس میں تازہ تازہ کسی نے خودکشی کی ہو۔ وہ امیر کبیر بیوہ یا مطلقہ نہ تھی۔ علاقہ کی بااثر سیاسی و سماجی حیثیت کی حامل باعزت اور باوقار خاتون تھی جو اپنے آبائی گھر میں کئی ملازموں کے ہمراہ تنہا رہا کرتی تھی۔ شوہر مشرقِ وسطیٰ میں گارمنٹس کا وسیع کاروبار کرتا تھا جو سال چھ مہینے بعد ہفتہ دو ہفتہ کے لئے آتا اور ہر بار صادقہ کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے مجبور کرتا۔ صادقہ ہر بار اسے اپنی اہمیت اور مرتبہ کا احساس دلا کر تنہا واپس بھیج دیتی۔ شادی کے ابتدائی سالوں میں ماں بننے کے مرحلے کے دوران پیچیدگی کے باعث زچہ و بچہ میں سے کسی ایک کی جان بچائی جاسکتی تھی صادقہ کے شوہر نے ڈاکٹروں سے، محبوب بیوی کی زندگی مانگ لی جو کبھی باپ نہ بننے کی قیمت پر مل سکی۔

''تقریر بہت عمدہ کرتی ہیں آپ۔ ایک ایک لفظ

chaharsu@gmail.com

موتی کی مانند لڑی میں پرو دیتی ہیں گویا۔''

''شکریہ'' میری جھوٹی تعریف کے جواب میں اس نے مختصر جواب دیا۔ ''آپ کی تعریف .....؟'' میرے سراپے کو جانچتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''خاکسار کو شکیل کہتے ہیں۔''

''کیا شغل ہے آپکا؟''

''مطالعہ'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔''

قدرے جھجکتے ہوئے اس نے کہا ..... ''اچھا شغل ہے۔ مگر میں آپ کی مصروفیات کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔''

''ایم۔اے کے بعد جاب کی تلاش ہے۔ پی ایچ ڈی کا ارادہ بھی ہے۔''

''گویا آج کل فارغ ہیں۔''

''کہہ سکتے ہیں۔''

''رفاہِ عامہ سے دلچسپی ہو تو ہمارے دفتر تشریف لائیے۔ انسانی خدمت سے بہتر وقت کا کوئی مصرف نہیں۔ خدا کرے گا جاب کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی۔''

یہ ہمارے تعلق کی باقاعدہ ابتدا تھی۔ واپسی پر میں اپنے اندر خاصی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ پارٹی میں کچھ نہ کھانے کے باوجود بھوک کے ساتھ نیند بھی غائب تھی۔ جسم میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہو رہا تھا جس میں تکلیف کے بجائے سرور کی کیفیت نمایاں تھی۔

دوسری صبح میں صادقہ سے پہلے اس کے دفتر میں موجود تھا۔ چند ساعت کے لئے اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت کا تاثر ابھرا۔ پھر وہ ورکنگ ویمین کی طرح بالکل نارمل ہوگئی۔ کچھ دن آنے جانے اور ہلکی پھلکی گفتگو کے علاوہ ڈھنگ کی کوئی بات نہ ہوسکی۔ قریباً ایک ہفتہ بعد اس نے مجھے آٹھ دس ڈسپنسریوں کا نگراں مقرر کر دیا۔ عملہ کی جانچ پڑتال' دوائیوں کی کمی بیشی' صفائی ستھرائی کے علاوہ مریضوں کی دیکھ بھال' سیریس مریضوں کے لئے ہسپتال میں علاج کا بندوبست میری ذمہ داری کا حصہ تھے۔ صادقہ تمام ڈسپنسریوں میں ہفتہ وار وزٹ کیا کرتی تھی۔ جس میں مختلف اوقات میں مختلف کارندے اس کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد اس ہفتہ وار وزٹ میں صادقہ کے ساتھ میری ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اس طرح میرا کچھ وقت اس کے ساتھ گزرنے لگا۔ تھوڑے عرصے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ سیاسی میٹنگوں میں بھی لے کر جانے لگی اور بہت سے امور پر مجھ سے مشورہ بھی لیا جانے لگا۔ فون پر گفتگو کے علاوہ کبھی کبھی ہمارا کچھ وقت ریسٹورانٹ میں بھی گزرتا۔ ایسا موقعہ تب ہی آتا جب کسی میٹنگ سے بروقت فراغت مل جاتی یا کسی گیدرنگ میں چائے بدمزہ ہوتی۔

ایک دن میں نے اپنی بیکاری کا گلہ کیا تو مجھے بہ غور گھورتے ہوئے بولی ''تمہارا مقصد فقط نوکری ہے تو میں بندوبست کئے دیتی ہوں۔ مگر میری خواہش ہے کہ تم تھوڑا تجربہ حاصل کرلو تو بہتر ہے۔''

صادقہ جہاں دیدہ' بردبار' ٹھنڈے مزاج کی مالک' ایک مہذب خاتون تھی۔ جلد بازی میں کبھی کوئی قدم نہ اٹھاتی جبکہ مجھ میں برداشت کا یارانہ تھا۔ میری گرمجوشی اکثر اسے شاکی کر دیتی۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود اس کی جانب میرا والہانہ التفات اس کے لئے خوشی کے ساتھ کبھی کبھی فکرمندی کا باعث بن جاتا اور وہ کافی دیر گم سم اور کھوئی کھوئی رہتی ..... پہلے کی نسبت میری پذیرائی میں اتنا فرق ضرور آیا کہ گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے پچھلی سیٹ پر اس کے برابر بیٹھنے کا حق دار بن گیا۔ اب ہماری گفتگو سیاسی' سماجی کے علاوہ زیادہ تر ذاتی ہوا کرتی۔ دورانِ گفتگو کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہوجاتے کہ دیکھنے والے کو ہم پر شادی شدہ جوڑے کا گمان ہونے لگتا۔ اب میری حیثیت صادقہ کے مشیرِ خاص یا سیکریٹری کی ہوگئی تھی۔ کوئی بھی مسئلہ مجھ سے ڈسکس کئے بغیر کبھی کوئی قدم نہ اٹھاتی۔ اب ہماری بیشتر ملاقاتیں اس کے گھر ہوا کرتیں جہاں وہ کام سے واپسی پر مجھے اپنے ساتھ لے جاتی۔ رات کا کھانا اکثر میں اس کے ساتھ کھایا کرتا۔ کھانے کے بعد چائے' کافی اور گفتگو گھنٹوں جاری رہتی اور ہمیں وقت کا احساس نہ ہوتا۔ ہماری گفتگو میں بیشتر جملے ذومعنی اور دوہری معنویت کے حامل بھی ہوتے ..... بلکہ اب تو مجھ میں اتنی جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ میں گاہے بگاہے براہِ راست اظہارِ عشق بھی کر بیٹھتا جس کا وہ قطعی برا نہ مانتی البتہ گفتگو کا موضوع خوبصورتی کے ساتھ بدل دیتی۔

وہ دن بڑا لُو اور حبس والا تھا۔ الیکشن کی آمد آمد تھی۔ سارا دن کارنر میٹنگوں کی نذر ہو گیا۔ تھکن کے مارے مجھے ایک کے بجائے دو نظر آنے لگے تھے۔ کچھ اثر موسم کا بھی تھا۔ میں نے اسے اس کے گھر کے باہر ڈراپ کر کے واپس جانا چاہا جس کی اس نے اجازت نہ دی..... کھانے کے بعد' میں چائے پینے کے حق میں نہ تھا۔ خراب موسم اور موسلا دھار بارش کے باعث جلد از جلد وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا کیونکہ میرے اندر کا شیطان آہستہ آہستہ مجھے ننگے رقص پر اکسا رہا تھا جس کی وہ مجھے ہرگز اجازت نہ دیتی۔ رات ڈھلتی گئی گفتگو طول پکڑتی گئی۔ وہ سکون واطمینان کی چادر میں لپٹی' چاند پری کی مانند ہمہ تن گوش جبکہ میری ساری توجہ اس کے ڈھلکے ہوئے آنچل کی مہربانیوں پر تھی۔ وہ اپنی ناآسودہ زندگی کے رازوں میں جی کھول کر مجھے شریک کر رہی تھی اور میں اس سے شریک بدن ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ باہر کے مہذب انسان پر اندر کا شیطان پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں آج یا پھر کبھی نہیں کے انداز میں دھمکی آمیز مطالبہ پیش کر دیا۔

گھبراہٹ' شرمندگی' رسوائی ..... سب خوف عارضی مزاحمت ثابت ہوئے .....ایک طوفان گھر کے باہر بپا تھا اور ایک گھر کے اندر۔ باہر کے طوفان کی شدت نے بادلوں کو پانی کی شکل میں برسا کر زمین کا سینہ ٹھنڈا کر دیا تھا مگر اندر کا طوفان کسی کو سیراب کئے بغیر ماند پڑ چکا تھا..... میرے اندر کا شیطان مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا؟ چند لمحے قبل کا مشتہی انسان یکا یک معصوم بچے میں تبدیل ہو چکا تھا' جسے صادقہ کی بھرپور اور بردبار چھاتیوں میں دنیا جہان کی آسودگی میسر آ گئی تھی؟؟؟

☆☆


روزگار پانے کا سب سے بڑا ذریعہ

**روزگار سماچار**

(ایڈیٹر: ڈاکٹر ابرار رحمانی)

اردو کے ساتھ انگریزی اور ہندی

میں بھی شائع ہونے والا

'**روزگار**' کا واحد ہفت روزہ اخبار

قیمت فی شمارہ: 12 روپے

قیمت سالانہ: 530 روپے

آن لائن خریداری کے لیے رابطہ کریں

www.bharatkosh.gov.in

تبسم زہرا

# اے زندگی

**آہستہ** آہستہ چہل قدمی کرتے ہوئے تمنا نے جب لان میں قدم رکھا تو اس کے چہرے کی طرح موسم بھی ناخوشگوار تھا، لگ رہا تھا کی اسی کی طرح آسمان بھی اپنے دکھ درد چھپانا چاہتا ہے اسی لیے اس کے چہرے کے بدلتے تاثر کی طرح کبھی ہلکی دھوپ نکل آتی اور کبھی سیاہی چھا جاتی اور پھر بارش کے چند قطرے گر کے تھم جاتے۔ اسی کی طرح آسمان کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگا ہے۔ اسی لیے آج نقاب سے جھانکتی ہوئی سورج کی ہلکی ہلکی کرنیں زمین کے لیے مسرت بخش نہیں بلکہ مایوسی سے لبریز تھیں، ہر طرف اداسی کا پہرہ تھا اور فضاؤں پر سکتہ سا طاری تھا۔

ہوا درد کی لہریں بن کر لان میں ٹہلتی ہوئی تمنا کے جسم پر کوڑوں کی طرح پڑ رہیں تھیں۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر ایک چیز کو جھنجھوڑ ڈالے، اپنے ناخنوں سے ہر ایک چیز کو اتنا نوچ کھسوٹ دے، کی اندر کی بھڑاس کے ساتھ ساتھ جسم سے ناخن بھی جدا ہو جائیں، لیکن وہ یہاں پر یہ سب کیسے کر سکتی تھی یہ تو اس کا دوسرا گھر تھا اور اسے یہاں آئے ہوئے ابھی سال بھر ہی تو گزرا تھا۔ اسی لیے یہ غم عذابِ جان بن کر اس کے جسم میں لاوے کی صورت میں پھوٹ کر آنکھوں کے ذریعہ باہر آنے لگا۔

اس کو محسوس ہوا کہ وہ کتنی اکیلی ہے کہ آج اس کے آنسو پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس کے خیالات نے کروٹ لی تو وہ سوچنے لگی کہ میری بزدلی کی یہی سزا ہے اور میرے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا، مجھ پر اتنے مصائب وغم کے پہاڑ ٹوٹیں کہ میں ان غموں کو اٹھا نہ سکوں ،کوئی مجھے دیکھنے والا نہ ہو۔ اس کے اندر کی الجھنیں بڑھتی جا رہیں تھیں وہ روکنگ چیئر (Rocking Chair) کی طرف بڑھی اور اس پر بیٹھ گئی، پھر اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف ٹکایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی اس کی پلکیں ایک بہت بڑا اسٹیج بن گئیں جس پر ایک دوسری دنیا آباد تھی۔ اس کی اور خلیل کے خوابوں کی دنیا، ایک ایسی دنیا جس کے بارے میں وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ حقیقی ہے یا خیالی، ایک ایسی دنیا جہاں کی ہر چیز سنہری تھی ، جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، جہاں اس کی حکومت تھی ، جہاں کی وہ شہزادی تھی، جہاں پھولوں کی خوشبو جنت کے عطر کی طرح معطر تھی ، سورج کی کرنیں ہر چیز کو منور کر دینے والی ، پرندوں کا نغمہ دل کو لبھانے والا تھا اور اس پر خلیل کی بے تحاشہ محبت دنیا کے دکھوں کو بھلانے کے لیے کافی تھا۔

تمنا اس سفر کو یاد کرنے لگی جو شاید اب اختتام کی طرف گامزن تھا۔ اس کو یاد آیا کہ خلیل سے اس کی ملاقات ایک سال پہلے مال (Mall) میں ہوئی تھی، جہاں اتفاق سے دونوں کے شاپنگ بیگ (Shopping Bag) بدل گیے تھے اور جب تمنا نے دیکھا کہ یہ سامان اس کا نہیں ہے تو وہ بیگ لے کر خلیل کو ڈھونڈنے لگی، اس نے دیکھا خلیل ایک کونے میں کھڑا کسی گہری سوچ میں گم لوگوں کا نظارہ کر رہا ہے، تمنا نے پیچھے سے آواز دیتے ہوئے کہا۔

''Hello Sir''

خلیل نے مڑتے ہوئے جواب دیا ''جی''

تمنا نے شاپر سے سامان نکالتے ہوئے پوچھا ''سر یہ آپ کا ہے''

خلیل نے کچھ چونکتے ہوئے کہا ''ہاں ہاں یہ تو میرا ہے لیکن یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا''

''سر شاید غلطی سے آپ نے میرا شاپر اٹھا لیا تھا'' تمنا نے آہستہ سے جواب دیا۔

'او' خلیل نے ایک گہری سانس لی۔

''آپ کا شاپر تو میں نے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیج دیا ہے ابھی بس دس منٹ انتظار کریں، میں ابھی منگائے لیتا ہوں''، خلیل نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً موبائل پر اپنے ڈرائیور سے بات کی اور شاپر لانے کے لیے بولا۔ تمنا نے شاپر خلیل کو تھما دیا اور وہیں ٹہلنے لگی۔

اتنے میں خلیل نے نہایت نرم لہجے میں معافی مانگتے ہوئے کہا ''آپ مجھے معاف کر دیں۔ میری وجہ سے آپ پریشان ہو گئیں''

''نہیں نہیں، کوئی بات نہیں، یہ تو ایک اتفاق ہے ''تمنا خلیل کو سمجھاتے ہوئے بولی

پھر خلیل بول پڑا ''نہیں معلوم آج کل مجھے کیا ہو گیا ہے کہ ہر چیز بھول جاتا ہوں، کچھ یاد نہیں رہتا'' کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر خلیل بول پڑا ''اگر آپ کچھ مائنڈ نہ کریں تو سامنے کافی شاپ پر ایک کپ کافی پی لی جائے، تب تک ڈرائیور آپ کا شاپر لے کر آجائیگا''۔ وہ کافی شاپ تک جانے کو تیار ہو گئی۔

کافی کا سپ لیتے ہوئے خلیل نے کہا ''کیا آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گی''

''ہاں بالکل سر، میرا نام تمنا ہے''

''بڑا اچھا نام ہے، کیا آپ ابھی اسٹوڈنٹ ہیں؟''

''جی سر میں نے سائیکلوجی سے ایم اے کیا ہے''

معرفت علی اصغر نقوی، مکان نمبر 98، نئی بستی
عبداللہ پور، قلعہ روڈ، میرٹھ۔ 250001
tabbasumzehra1@gamil.com

''اچھا تمنا آپ نے چونکہ نفسیات کی پڑھائی کی ہے تو آپ نفسیات کا علم بھی رکھتی ہوں گی''۔

''ہاں بس یوں ہی سا''

''اچھا آگے کا کیا ارادہ ہے کیا کرنا ہے''

سر میرا خواب تو یہی ہے کہ میں سائیکو تھیرپسٹ بن جاؤں''۔

''انشاءاللہ، ایسا ہی ہوگا تم کافی شارپ ہو، تم بس اپنے مقصد پر نظر رکھو، سب کچھ ہو جائے گا''۔

''سر آپ کا نام؟ تمنا کچھ زور دیتے ہوئے بولی''۔

''دراصل تمنا میرا نام خلیل الرحمٰن ہے اور میں ایک کالج میں لکچرر ہوں۔ ویسے میرا ارادہ بھی سائیکو تھیرپسٹ بننے کا تھا، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا'' ہاں میں ماہر نفسیات ہونے کا فائدہ اپنی کہانیوں میں دکھاتا ہوں''۔

''سر یعنی آپ فکشن رائٹر ہیں''۔

''ہاں میں کہانیاں لکھتا رہتا ہوں، کہانیاں چونکہ زندگی کے مختلف رنگوں کو پیش کرتی ہیں اور میں زندگی کے مختلف رنگوں سے واقف ہوں اس لیے مجھے کہانی لکھنے میں اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے''۔

''لیکن سر آپ سائیکو تھیرپسٹ کیوں نہیں بنے ؟'' تمنا نے کچھ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بس کچھ وقت نے ساتھ نہیں دیا اور کچھ حالات سازگار نہ تھے۔ تمنا یہ زندگی بڑی عجیب ہے کب، کیوں، کہاں، کیسے موڑ لے لے کچھ کہا نہیں جا سکتا''۔

'' اچھا سر آپ کو پڑھاتے ہوئے کتنے سال ہو گئے''۔

''یہی کوئی تیس پینتس سال''

''اچھا تو پھر ہمیں آپ سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا''۔

''ہاں بالکل، آپ کو مجھ سے جو کچھ پوچھنا ہوگا آپ پوچھ سکتی ہیں''۔

خلیل پھر بولا ''تمنا کیا تم یہیں آس پاس رہتی ہو''

''نہیں ہمارا گھر تو یہاں سے چھ سو کلومیٹر دور ہے ہم تو یہاں کسی کام سے آئے تھے اور آج شام کو ہی چلے جائیں گے لیکن اگر آپ ہم کو اپنا موبائل نمبر دے دیں تو مہربانی ہوگی''، تمنا نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کا نمبر لیا، خلیل نے تمنا کو نمبر دیتے ہوئے کہا ''تمنا تم مجھے کسی بھی وقت کال کر سکتی ہو اور اگر تم مجھے اپنا پتہ میسج کر دو گی تو میں تمھیں اپنی کہانیوں کا مجموعہ بھیج دوں گا''۔

''او کے سر'' تمنا نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

پھر ڈرائیور شاپر لے کر آ گیا۔ تمنا بیگ لیتے ہوئے کرسی سے اٹھی اور خلیل سے بولی ''سر ہمیں آپ سے مل کر بہت اچھا لگا، یہ اتفاقیہ ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی''۔

''ہاں مجھے بھی بہت اچھا لگا'' خلیل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں رخصت ہو گیے۔ رخصت ہوتے ہوئے تمنا کو محسوس ہوا کہ شاید وہ کہیں نہ کہیں خلیل کے دل میں اتر گئی ہے کہ اس کی گواہی خلیل کی آنکھیں دے رہیں تھیں۔

تمنا کے جانے کے بعد خلیل نے سوچا کہ یہ پندرہ منٹ کتنے سکون بخش تھے ان چند لمحوں نے میری ساری تھکان اتار دی اور مجھے وہ سکون ملا کہ جس کی مجھے تلاش تھی، شام کو تمنا جب اسٹیشن کے لیے نکلی تو اچانک اس کے موبائل پر ایک میسج رنگ بجی۔ اس نے موبائل آن کیا تو خلیل کا میسج تھا، خلیل نے لکھا تھا ''تمنا اگر تم کل صبح بارہ بجے تک کال کرو گی تو مجھے بڑی خوشی ہوگی''۔

لیکن گھر پہنچ کر تمنا مصروفیت کی وجہ سے خلیل کو کال نہ کر سکی، تین روز بعد جب تمنا نے خلیل کو کال کی، تو اسے تمنا کی کال پا کر ایسا اطمینان ہوا جو زندگی میں شاید پہلے نہ ہوا تھا۔ اس نے تمنا سے بہت سی باتیں کیں۔ اس وقت تمنا نے جو خوشی اس کی باتوں میں محسوس کی وہ عجیب ہی تھی۔ تمنا فون رکھنے کے بعد دیر تک سوچتی رہی کہ اسے کال کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی اسے ابھی خلیل کے بارے میں کچھ جاننا چاہیے تھا۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا کہ اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ لیکن اب تمنا نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب خلیل کو کال نہیں کرے گی۔

پھر اگلے روز خلیل نے کال کی اور تمنا سے اپنا پتہ بھیجنے کے لیے کہا، تمنا نے لاکھ سمجھایا کہ سر ہمیں ابھی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے ہم آپ سے ضرورت پڑنے پر کتابیں مانگ لیں گے، لیکن خلیل نے تو جیسے ضد پکڑ لی ہو، پھر خلیل نے اس کے لیے بہت سی کتابیں بھیج بھی دیں۔

اب روز روز کالوں کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ ہر دن یہ لوگ ایک دوسرے کو کال کرتے اور اپنے سکھ دکھ بتاتے۔ اس نے تمنا کو اپنے گھر کے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تمنا میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا، جس میں کوئی خوشی نہ ہو، جس کا کوئی مقصد نہ ہو، تمنا اب تک میں زندگی سے چھٹی کر لیتا، میں زندگی سے اتنا عاجز آ گیا تھا کہ مجھے لگنے لگا تھا کہ خلیل تو جی کر کیا کرے گا، تجھے جینے کا کوئی حق نہیں ہے میں وہاں مال میں کھڑا زندگی سے پیچھا چھڑانے کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ اتنے میں تم آ گئیں، پھر تم سے ملاقات کے بعد میرے اندر روشنی کی ایک کرن پیدا ہو گئی، تمنا تم جس طرح بات کرتی ہو اس سے میرے اندر جینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی کو مقصد مل گیا ہے۔ تمنا میں تمہارے خوابوں کو پورا کرنے میں تمہارا ساتھ دینا چاہتا ہوں'' یہ سب سن کر تمنا پریشان ہو گئی اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموشی کے بعد تمنا نے خلیل کو سمجھانے کی کوشش کی اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دے گی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ہی تمنا اور خلیل ایک اچھے اور قریبی دوست بن گئے تھے۔ خلیل دن بہ دن تمنا کے لیے جذباتی ہوتا جا رہا تھا اور تمنا خلیل کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کو روک نہیں پا رہی تھی، جس سے وہ ہر وقت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہتی اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ خلیل سے دور چلی جائے یا اس کا ساتھ دے، کیونکہ وہ خلیل کو موت کے منہ میں جانے نہیں دینا چاہتی تھی اور خود اس کے ساتھ نہیں چل سکتی تھی وہ جب بھی خلیل سے باتیں کرتی اسے محسوس ہوتا کہ خلیل اس سے باتیں کر کے بہت خوش رہتا ہے اور اپنی زندگی سے وابستہ پریشانیاں بھول جاتا ہے اسے خودکشی کا خیال نہیں آتا اور جب خلیل تمنا سے کہتا ''تمنا میں تم سے بات کرنے کے لیے پورے پورے دن انتظار کرتا ہوں'' تو اس وقت تمنا کے اندر ہمدردی کے جذبات امڈنے لگتے اور اس کا دل چاہتا کہ وہ خلیل کے لیے کیا کر دے۔

مال میں ہوئی پندرہ منٹ کی ملاقات نے دونوں کی زندگی کو پوری طرح متاثر کیا تھا انھیں کیا معلوم تھا کہ پندرہ منٹ پھیل کر ان کی پوری زندگی پر حاوی ہو جائیں گے۔ اس ملاقات نے ان دونوں کی زندگی کو ایسے جذباتی دھاگے سے باندھا تھا کہ لوگ برسوں برسوں ساتھ رہنے کے بعد بھی نہیں بندھ پاتے۔ اب تمنا خلیل کی خوشیوں کا خیال کرتے کرتے اس کی انگلیاں تھامے بہت دور نکل آئی تھی اور خلیل نے بھی تمنا کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اس کی خوشیاں، اس کا غم، امیدیں، زندگی کا مقصد سب کچھ

تمنا پر ہی آ کر رک گیا تھا۔

خلیل جب اس سے کہتا ''تمنا تم تو میری زندگی ہو، تم تو میری جان ہو، تم میری کائنات ہو، تمنا تم بھی مجھ سے پیار کرتی ہو نا'' تو اسے کبھی سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگر وہ سچ بولے گی تو خلیل کا دل ٹوٹ جائے گا اور اگر جھوٹ بولے گی تو اس کا ضمیر ملامت کرے گا۔ اسی لیے اس نے بہت بار خلیل کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا، خلیل میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ لیکن یہ پیار یہ محبت دوستانہ ہے تو یہ سن کر خلیل کچھ پریشان سا ہو جاتا اور کہنے لگتا۔

''تمنا میں ایک ایسا بدنصیب شخص ہوں جس نے ہمیشہ محبتیں بانٹیں، لیکن خود ہمیشہ میرا دامن اس محبت سے خالی رہا اور شاید یہ دکھ لے کر ہی میں اس دنیا سے جاؤں گا''

یہ سب سن کر تمنا کچھ جذباتی ہو جاتی اور پھر اس کے اندر اپنے دوست کے لیے نیا جذبہ پیدا ہوتا اور وہ کہنے لگتی کہ ''خلیل میرے دوست میں کوشش کروں گی کہ میں تمہارے لیے وہ جذبہ پیدا کر سکوں۔ جس کے تم متلاشی ہو''۔

لیکن اگلے ہی پل وہ پھر خلیل سے سوال کر بیٹھتی ''خلیل یہ بتاؤ کیا تمہیں میرے رویوں میں میری باتوں میں محبت نظر نہیں آتی، خلیل کیا تمہارے لیے میری لامحدود دوستانہ محبت کافی نہیں ہے''۔

اس پر خلیل جواب دیتے ہوئے کہتا۔ ''دیکھو تمنا یہ محبت میرے لیے بہت اہم ہیں اور دیکھو میں جانتا ہوں کہ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم جیسی دوست ملی، لیکن تمنا میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی تو ہو جو مجھ سے سچی محبت کرے، کوئی تو ہو جو میرا سر اپنے سینے پر رکھ کر کہے خلیل میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں، خلیل میں صرف تمھاری ہوں، خلیل تم پریشان نہ ہونا'' یہ کہتے کہتے خلیل رک جاتا اور اس کی آواز تھرا جاتی۔ فوراً تمنا خلیل کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور کہتی ''خلیل مجھے لگتا ہے دنیا کا سب سے عظیم رشتہ دوستی کا ہے جو انسان خود بناتا ہے اور میرے دوست تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ لیکن خلیل تمھیں اگر دوسری محبت چاہیے تو میں پوری کوشش کروں گی کہ میرے اندر تمہارے لیے محبت کا وہ جذبہ پیدا ہو جائے۔ لیکن تمہیں میری قسم تم کبھی خود کو بدنصیب، بے بس نہیں کہو گے، تم کبھی خودکشی نہیں کرو گے، خلیل تمھیں مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا، تم اپنی دوست کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جاؤ گے، بہت سے لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے۔ خلیل وعدہ کرو، وعدہ کرو'' یہ کہتے کہتے وہ رونے لگتی۔

خلیل وعدہ کر لیتا اور پھر دونوں محبت سے لبریز دوستانہ زندگی گزارنے لگتے، اب خلیل کا مقصد تمنا کو آگے بڑھانا تھا اور تمنا کا مقصد اسے کسی بھی طرح مایوس نہ ہونے دینا تھا۔

لیکن پھر جب تمنا کی شادی کا ذکر گھر میں ہونے لگا اور اس نے خلیل کو بتایا۔ تو خلیل پر جیسے بجلی سی گر پڑی، اس نے تمنا سے صاف صاف کہا کہ تمنا تم شادی سے انکار کر دو۔ اگر تم نے شادی کی تو ہمارا ساتھ چھوٹ جائیگا اور میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا، تمنا میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بس چند سال، تم اس کے بعد شادی کر لینا، میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں، میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہیں کوئی مجھ سے شیئر کرے۔ اگر تم نے شادی کی تو میں اسی دن خودکشی کر لوں گا۔

خلیل کی یہ باتیں سن کر تمنا تو جیسے سائیں بائیں ہو جاتی اور خلیل کو اپنی قسمیں دینے لگتی، خلیل تم ایسا نہیں کر سکتے، دیکھو اگر میری شادی ہو بھی گئی تو میں پوری کوشش کروں گی کہ تم سے ایسے ہی بات کرتی رہوں۔

لیکن خلیل کسی طرح سے سمجھنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا، کیونکہ اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کی شادی ہو کر وہ مجھ سے تو بچھڑ ہی جائیگی ساتھ ہی زندگی بھر کچھ نہ کر سکے گی، وہ بھی ایک عام عورت کی طرح زندگی گزارے گی اور خلیل ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ تمنا سب عورتوں کی طرح عام سی گھریلو عورت بن کر جیئے۔

لیکن تمنا کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں جو اسے ہر وقت الجھائے رکھتی۔ وہ خلیل کی دوستی کی وجہ سے ان سب چیزوں پر بہت احتجاج کرتی مگر اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے ہاتھ میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ نہ اس کی زندگی اور نہ خلیل کی زندگی۔ اس نے اپنی اور خلیل کی زندگی کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ وہ چاروں طرف سے گھر چکی تھی ایک طرف خلیل کا بے تحاشہ عشق تھا اور دوسری طرف گھر والوں کی لامحدود محبت تھی، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کسے چنے۔ پھر اس کو گھر والوں کی بات ماننی پڑی لیکن اس نے خلیل سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ وقت ملنے پر ہمیشہ اس سے باتیں کرے گی۔

تمنا کی شادی ہوگئی تھی۔ خلیل سے اب اس کی باتیں کبھی کبھی ہونے لگیں تھیں۔ خلیل کو پھر سے اپنی زندگی بے معنی لگنے لگی تھی۔ اس کو یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ جس مقصد کی وجہ سے اس کو شادی سے روکتا تھا اب تمنا وہ کبھی نہ کر پائے گی۔ تمنا اب گھریلو ذمہ داریوں میں گھر چکی تھی۔ اسے جیسے ہی وقت ملتا وہ خلیل سے بات کر لیتی۔ وہ خلیل کے ساتھ ہوئی دوستی کو نبھانا چاہتی تھی وہ کبھی اسے ٹوٹتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی، لیکن جب تمنا کے شوہر نے اس پر کچھ بندشیں لگا دیں تو وہ مجبور ہوگئی، لیکن دوسری طرف خلیل اس کے فون کے انتظار میں رات دن جاگتا رہتا۔

مایوسی کے عالم میں خلیل پر پھر سے خودکشی کا بھوت سوار ہونے لگا تھا۔ وہ ہر وقت سوچتا کہ شاید خدا نے صرف اور صرف اس کے لیے دکھ بنائے ہیں اور دکھ درد ہی اب اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہو گیے ہیں اور وہ کبھی اب ان سے باہر نہیں نکل سکے گا۔ اس کا ہر لمحہ تمنا کی کال کے انتظار میں گزرتا۔ جس سے اس کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ ایک دن صبح خلیل نے جب بستر سے نیچے قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر بھاری بھاری ہو رہا ہے وہ جب کھڑا ہوا تو چکر کھا کر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر اٹھ نہ سکا۔ تمنا نے وقت ملتے ہی جب اسے کال کی تو اس کے دوست نے بتایا کہ وہ اسپتال میں زندگی اور موت سے جوجھ رہا ہے۔ تمنا نے پوری رات روتے ہوئے آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔

Rocking Chair پر بیٹھی ہوئی تمنا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کو محسوس ہوا جیسے اس کے وجود میں کچھ ہل چل مچ رہی ہے، جیسے کسی نے کروٹ لینے کی کوشش کی ہو، وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ کچھ سوچنے کے بعد وہ کھڑی ہوگئی اور خلیل کی خیریت لینے کے لیے موبائل کی طرف دوڑی۔ کال کرنے پر اس کے دوست نے بتایا کہ خلیل نے وعدہ وفا کرنے کے لیے خودکشی کا ارادہ بدل کر ایک ایسی موت کو چنا تھا جو مسلسل موت تھی لیکن بظاہر زندگی تھی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ خلیل اب کبھی نہیں اٹھ سکے گا۔ وہ ڈیپ کوما میں چلا گیا ہے۔

تمنا نے جیسے ہی سنا کہ وہ اب کبھی نارمل نہیں ہو سکے گا وہ غش کھا کر گر پڑی۔ اسے اسپتال لے جایا گیا۔ تمنا کا مسکیرج ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کسی قدر اس کا ذہنی توازن بھی بگڑ گیا تھا۔ تمنا کا علاج چل رہا تھا۔

ایک دن ڈاکٹر نے بتایا کہ اب تمنا کبھی ماں نہیں بن سکے گی، اب تمنا تھی اور اس کی یادوں میں بسا ہوا خلیل تھا اور یہی یادیں تمنا کی زندگی کا اثاثہ بن گئی تھیں۔ ☆☆

پروفیسر صادق

# اس شکل سے گزری غالب

## (طویل ڈرامے کا ایک باب)

**پردہ** اٹھتا ہے، منچ پر اندھیرا ہے۔ ہلکی موسیقی کے ساتھ دھیرے دھیرے منچ کا آدھے سے زیادہ حصّہ روشنی میں آجاتا ہے۔ رہ گزر پر کئی لوگ اِدھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ اچانک موسیقی کی آواز رُک جاتی ہے۔ منچ پر موجود لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت ہوجاتے ہیں۔ چند لمحے اسی طرح گزر جاتے ہیں۔

اچانک ڈرم کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ساکت لوگوں میں حرکت آجاتی ہے۔ وہ سب دائیں طرف دیکھتے ہیں۔ جنگی سپاہی کی وردی میں ملبوس ایک جوان آدمی (میرزا یوسف) ڈرم کی آواز کے ساتھ مارچ کرنے کے انداز میں بڑی شان کے ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار ہے جو اس نے اپنے کاندھے سے لگا رکھی ہے۔ راہ گیر اسے احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ چند لوگ جُھک جُھک کر سلام بھی کرتے ہیں۔ وہ آدمی سپاہیانہ رعونت کے ساتھ منچ پر دو تین چکر لگاتا ہے۔ لوگوں کے سلام کے جواب وہ اپنے سر کی جنبش کے ساتھ دیتا جاتا ہے۔

یکا یک ڈرم کی آواز تیز ہوجاتی ہے۔ آواز کے ساتھ وہ شخص ہواؤں میں تلوار گھماتا ہوا پینترے بدلتا ہے۔ آس پاس موجود لوگ سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور سب ٹولیوں میں سمٹ کر حیرت وخوف کے ساتھ شمشیر زن کو دیکھنے لگتے ہیں جو ڈرم کی رفتہ رفتہ تیز ہوتی ہوئی آواز کے ساتھ تیزی سے اپنی تلوار گھماتا ہوا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑنے لگتا ہے۔ وہ جس طرف جاتا ہے اُدھر کی ٹولیوں کے لوگ خوف زدہ ہوکر چیختے چلاتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ دوسری ٹولیوں کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ چند لمحوں تک یہی عمل جاری رہتا ہے۔ ڈرم کی آواز تیز تر ہوتی جاتی ہے اسی کے ساتھ شمشیر زن کی حرکات اور لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی تیز تر ہوتی جاتی ہیں۔ پھر اچانک آوازیں بند ہوجاتی ہیں۔ لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت ہوجاتے ہیں۔

شمشیر زن گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ سب لوگ کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے آکھڑے ہوتے ہیں اور اسے حیرت وخوف سے دیکھنے لگتے ہیں۔ شمشیر زن اپنی تلوار کو چومتا ہے پھر اس کے دونوں سروں کو ہاتھوں میں لے کر تلوار پر نظریں جما دیتا ہے۔ پھر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ پھر سر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور پھر کہتا ہے)

**شمشیر زن:** یہ تلوار قدرت نے نہیں بنائی آدمی نے بنائی ہے۔ سارے ہتھیار آدمی ہی بناتا ہے۔ دوسروں کو مارنے کے لیے۔ جانداروں کی جان لینے کے لیے۔ تمام ہتھیار آدمی ہی بناتا ہے۔ آدمی ہی چلاتا ہے۔ دوسروں کی دولت چھیننے کے لیے۔ دوسروں کی زمین، عورت اور حکومت چھیننے کے لیے۔ ہر وہ چیز چھیننے کے لیے جس کی اسے خواہش یا ضرورت ہو۔

(چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے)

میرے باپ دادا نے زندگی بھر یہی کام کیا ہے۔ خود میں نے بھی کچھ عرصے تک یہی کام کیا ہے۔ کسی کی دولت، عورت اور زمین چھیننے کے لیے نہیں، کسی کی جان لینے کے لیے بھی نہیں بلکہ اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنے اور ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے۔

(چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آسمان کی طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے)

پھر ایک دن مجھے اپنے باپ کا خیال آیا۔ وہ ایک جنگ میں مہاراجہ الور کی طرف سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اپنی بیوی بچوں، ماں اور بہنوں سب کو بے سہارا چھوڑ کر وہیں کہیں پیوندِ خاک ہوگیا...

(چند لمحے خاموش رہ کر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔)

پھر مجھے ان سپاہیوں کا خیال آیا جو میدانِ جنگ میں میری تلوار سے مارے گئے اور پھر ان کے اہل وعیال کا خیال آیا تو مجھے اپنے پیشے سے اور خود اپنے آپ سے نفرت ہوگئی اور میں وہ ملازمت چھوڑ کر حیدرآباد سے دہلی واپس آگیا... لیکن میرے ہاتھ سے مارے گئے ایک نوجوان سپاہی کا معصوم سا چہرہ اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں ساتھ چلی آئیں۔ وہ میرے ذہن و دل پر چھا گئیں۔ بھلائے نہیں بھولتی ہیں، مجھے بے چین کیے دیتی ہیں، اوہ! میرے خدا... میرے خدا میں کیا کروں؟

(بے حد جذباتی ہوکر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ہاتھ میں تلوار اٹھا کر چیختا ہوا ایک طرف بڑھتا ہے۔ لوگ سہم کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ شخص چیختے ہوئے اپنی تلوار سرِ راہ ابھرے ہوئے ایک بڑے سے پتھر پر مارنے لگتا ہے اور مسلسل مارتا رہتا ہے اور پھر اسے ایک طرف پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ جھٹکتا ہے۔ سر جھکا لیتا ہے اور گردن جھکا کر دھیرے دھیرے چلنے لگتا ہے۔ موجود لوگوں کی ٹولیاں حرکت میں آجاتی ہیں۔ مختلف لوگوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔)

ایک شخص: لگتا ہے یہ پاگل ہوگیا ہے۔

دوسرا شخص: اس کا دماغ چل گیا ہے۔

تیسرا شخص: ارے یہ تو پگلا گیا ہے۔

چوتھا شخص: دیوانہ ہے دیوانہ ہے۔

(سارے لوگ چیختے چلاتے ہوئے اُس کے پیچھے

B-33، پاکٹ 9، جسولہ، نئی دہلی۔25
فون: 9818776459

پیچھے چلنے لگتے ہیں۔)

ایک شخص: میرزا پاگل دیوانہ

دوسرا شخص: دیوانہ ہے دیوانہ

تیسرا شخص: میرزا یوسف دیوانہ

سارے لوگ: دیوانہ ہے دیوانہ

پہلا شخص: پاگل باؤلا دیوانہ

سارے لوگ: دیوانہ ہے دیوانہ

ایک اور شخص: دیوانے کو مارو مارو

دوسرا شخص: مارو مارو

سب لوگ: مارو مارو دیوانے کو مارو مارو مارو مارو...

(کوئی اس کا دامن کھینچتا ہے، کوئی ہاتھ کھینچتا ہے، کوئی دھکا دینے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی اسے مارنے لگتا ہے۔ مرزا یوسف خوف زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتا ہے اور بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاگنے لگتا ہے۔ سب اس کے پیچھے دوڑتے ہیں اور مارتے رہتے ہیں۔ مرزا یوسف زمین پر گر پڑتا ہے۔ اچانک ایک طرف سے مرزا غالب دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔)

**مرزا غالب:** یوسف، یوسف... میرے بھائی (کہتے ہوئے اس کے قریب آجاتے ہیں۔ سب لوگ اِدھر اُدھر چلے جاتے ہیں۔ غالب اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہیں۔ یوسف خوف زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے ہنگم آوازیں نکالتا ہے اور اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔)

مرزا غالب: (اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے) یوسف، یوسف ٹھہر جاؤ، ٹھہر جاؤ میرے بھائی.....

(دونوں آگے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ یوسف رُک جاتا ہے۔ اپنے آگے کی طرف نیچے دیکھتا ہے۔ پھر پلٹ کر غالب کی طرف دیکھتا ہے۔)

**مرزا غالب:** (بہت زور سے چیخ کر) رُک جاؤ میرے بھائی۔ آگے خطرناک کھائی ہے۔ گر جاؤ گے۔

(یوسف ایک بار پھر اپنے آگے کی طرف نیچے جھک کر دیکھتا ہے۔ پھر پلٹ کر غالب کو دیکھتا ہے اور پھر ایک زوردار چیخ مار کر آگے کود پڑتا ہے۔ منچ پر اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں غالب کی اسے پکارنے کی آوازیں اور یوسف کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔

اندھیرے میں روشنی کا دائرہ منچ کے دوسرے کنارے کا منظر دکھاتا ہے۔ پلنگ پر کوئی شخص سو رہا ہے، قریب ہی ایک تپائی رکھی ہے جس پر صراحی پانی پینے کا کٹورا، چند کتابیں اور مرزا غالب کی مخصوص ٹوپی نظر آرہی ہے۔ پلنگ پر سویا ہوا شخص نیند میں کچھ بڑبڑاتا ہے اور پھر چیخ مار کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ حیران ہو کر خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے اور تپائی پر رکھی ٹوپی پہن کر دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر کی طرف دائیں بائیں دیکھتا ہے اور پھر پردہ چھوڑ کر واپس پلنگ پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ حیران و پریشان ہو کر کہتا ہے)

**مرزا غالب:** یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ دن بھر فکریں اور اندیشے پریشان کرتے رہے ہیں۔ راتوں کو خواب ستاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کتنا خوف ناک خواب دیکھا میں نے کہ یوسف مجھ سے ہاتھ چھڑا کر کھائی میں چھلانگ لگا دیتا ہے پھر اس کے پیچھے میں بھی چھلانگ لگا دیتا ہوں۔ زمین پر پاؤں پڑنے کے بعد اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یکا یک ایک سمت سے اس کی آواز آتی ہے۔ میں آواز کی طرف دوڑ پڑتا ہوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں (سراسیمہ انداز میں) کہ کسی نے یوسف کو دبوچ رکھا ہے۔ یوسف اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا ہے۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا۔ یوسف کا سر اس کے دھڑ سے علاحدہ ہو گیا ہے۔ اُس کا کاسۂ سر کھلا ہوا ہے اور خوف ناک شکل کی ایک عورت اپنے ناخنوں سے اس کے مغز کو کھرچ کھرچ کر کھا رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر دانت کچکچاتی ہوئی میری طرف آتی ہے۔ اچانک میری نظر اس کے پیروں پر جاتی ہے... میں چونک پڑتا ہوں۔ اس کے پنجے پیچھے اور ایڑیاں آگے کی طرف تھیں، وہ جھپٹ کر میری گردن میں اپنے دانت گاڑنا چاہتی ہے۔ میں چیخ پڑتا ہوں۔ اسی وقت آنکھ کھل جاتی ہے۔ پتہ چلتا ہے خواب دیکھ رہا تھا۔ (صراحی سے کٹورے میں پانی انڈیلتے ہوئے) کہہ نہیں سکتا کہ میں جاگ چکا یا اب بھی خواب میں ہوں (صراحی تپائی پر رکھ کر پانی پیتے ہوئے) میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا ہوں کیا یہ سب خواب ہی کا حصّہ ہے؟ (کچھ لمحے رُک کر) مجھے تو اپنی ساری زندگی خواب جیسی لگتی ہے۔ میرے بچپن ہی میں باپ کا مرجانا، پھر میرا اپنے چچا کے سایہ عاطفت میں جانا اس کے کچھ عرصے بعد چچا کا ہاتھی سے گر کر شدید زخمی ہونا اور پھر اُن کا بھی انتقال ہو جانا۔ پھر انگریز حکومت کا ان کی جاگیریں ضبط کر لینا اور ہمارے لیے خاندانی پنشن مقرر کر دینا اور پھر چچا کے ایک خانہ زاد ملازم خواجہ حاجی کو ہماری خاندانی پنشن کا سب سے بڑا حصّے دار بنا دیا جانا۔ یہ سب کیا تھا؟ میں تو اس وقت صرف نو برس کا تھا اور میرا بھائی یوسف صرف سات برس کا۔ ہمارے ساتھ جو ناانصافی ہوئی اسے ہم دونوں کیا سمجھتے؟ بچے ہی تو تھے۔ یہ ساری باتیں خواب کی سی لگتی ہیں۔ زندگی اب تک جس شکل میں گزری، خواب و خیال کی طرح ہی تو ہے۔

(باقی پانی پی کر کٹورا تپائی پر رکھ دیتے ہیں... پیچھے سے غالب جیسے حلیے والا ایک شخص نمودار ہوتا ہے جو غالب کا ہمزاد ہے۔ وہ غالب کے ٹھیک سامنے کھڑا ہو جاتا ہے اور مسکراتے ہوئے کہتا ہے)

**ہمزاد:** خواب و خیال کی دنیا سے باہر آجاؤ اسداللہ۔ اب تم نو سال کے بچے نہیں رہے۔ انتیس سال کے بھرپور مرد ہو۔

**مرزا غالب:** تم پھر آگئے میرے دشمن۔ جب دیکھو چلے آتے ہو۔ مجھے پریشان کرنے کے لیے۔

**ہمزاد:** دشمن نہیں، ہمزاد ہوں تمہارا۔ ہمیشہ تمہارے ساتھ ہی رہتا ہوں اور جب بھی ضرورت ہوتی ہے تمھیں روکنا ٹوکنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

**مرزا غالب:** جب بھی آتے ہو جلی کٹی باتیں کر کے میری پریشانیوں میں اضافہ کر دیتے ہو۔ مجھے نہیں چاہیے ایسا ہمزاد۔

**ہمزاد:** تمہیں چاہیے یا نہ چاہیے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں تو زندگی بھر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ مجھے اپنی بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

**مرزا غالب:** تو بتاؤ کہ ابھی ابھی میں نے جو خواب دیکھا تھا اس کے کیا معنی ہیں؟

**ہمزاد:** خواب پریشان خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے طور پر اس کے معنی نکال لیتے ہیں۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔

**مرزا غالب:** تو میرا بھائی مرزا یوسف صحیح سلامت ہوگا نا؟

**ہمزاد:** وہ بالکل ویسا ہی ہوگا جیسا تم اسے چھوڑ کر آئے ہو۔ بھلا خواب اس کا کیا بنا یا بگاڑ سکتا ہے؟

**مرزا غالب:** تم تو جانتے ہوں گے کہ سپہ گری کے فن میں وہ کتنا ماہر ہے۔ اسی وجہ سے تو دولتِ آصفیہ میں اسے بڑا عہدہ ملا تھا۔ دہلی سے حیدرآباد روانہ ہوتے وقت جب وہ گھوڑے پر سوار ہوا تھا تو اماں نے اس کی

بلائیں لیتے ہوئے کہا تھا کہ یوسف بالکل اپنے باپ کی طرح لگ رہا ہے۔

**ہمزاد:** جوان بیٹوں کو دیکھ کر مائیں ایسا ہی کہتی ہیں۔ اس وقت انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن اب یوسف کو دیکھ کر کون ایسا کہے گا؟

**مرزا غالب:** حیدر آباد میں وہ بالکل ٹھیک تھا۔ پابندی سے مجھے خط لکھا کرتا تھا۔ وہ میری پریشانیوں سے بہت فکر مند تھا۔ تنخواہ کے روپے جمع کر رہا تھا تاکہ مہاجنوں کا قرض ادا کر کے میری پریشانیوں کو دور کر سکے۔

**ہمزاد:** میں جانتا ہوں۔ وہ بھی تم سے بڑی محبت رکھتا ہے۔

**مرزا غالب:** پھر کچھ عرصے بعد اس نے مجھے لکھا کہ وہ کسی بزرگ کا مرید ہو گیا ہے اور اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق آدھی رات کو اٹھ اٹھ کر کوئی وظیفہ پڑھتا رہتا ہے تاکہ ہماری ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں۔

**ہمزاد:** پھر؟

**مرزا غالب:** پھر ایک عرصے بعد اس نے مجھے لکھا کہ وہ چھٹیوں پر گھر آ رہا ہے۔ اپنی تنخواہ کے جمع شدہ روپے بھی لا رہا ہے تاکہ مہاجنوں کا قرض ادا ہو سکے لیکن جب وہ دہلی آیا تو اس کے پاس تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

**ہمزاد:** اس بارے میں یوسف کیا کہتا ہے؟

**مرزا غالب:** وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہی کب ہے؟ اپنے گھر اور گھر والوں تک کو نہیں پہچانتا، عجیب عجیب حرکتیں کرتا اور چیختا چلاتا رہتا ہے۔ خیر ہوئی کہ کچھ لوگوں نے اسے پہچان لیا اور میرے پاس لے آئے۔

**ہمزاد:** اس کے بارے میں اور لوگوں سے بھی تو کچھ پتہ چلا ہوگا۔ وہ کیا کہتے ہیں؟

**مرزا غالب:** میں نے حقیقت معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی اطمینان بخش بات معلوم نہ ہو سکی۔ سوائے اس کے کہ حیدر آباد سے دہلی آتے ہوئے اس کا سب کچھ لٹ گیا۔ کسی نے یہ مشہور کر دیا کہ وہ راتوں میں وظیفہ پڑھا کرتا تھا اسی میں کوئی غلطی ہو گئی جس کی وجہ سے اس کا دماغ الٹ گیا۔ اماں کہتی ہیں کہ کسی بدخواہ نے میرے بیٹے کو ایسا کچھ کھلا پلا دیا کہ اس پر جنون سوار ہو گیا۔ یوسف کی بیوی کو کسی نے یہ باور کرا دیا ہے کہ حیدر آباد میں وہ کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور اسی دکنی جادوگرنی کی وجہ سے یہ حالت ہو گئی ہے۔

ہمزاد: اور خود تمہارا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟

**مرزا غالب:** شادی کے بعد وہ شدید مالی پریشانیوں کا شکار ہو گیا تھا۔ خاندانی پنشن کے حصے داروں میں تو اس کا نام تک نہیں۔ میں ہی اپنی پنشن میں سے آدھی اسے دے دیا کرتا تھا۔ یوسف والد مرحوم کی چھوڑی ہوئی املاک کو بیچ بیچ کر کسی طرح اپنا گزارا کرتا رہا۔ پھر اسے حیدر آباد والی ملازمت مل گئی جس سے بڑی امید بندھ گئی تھی لیکن ... (دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتے ہیں)

ہمزاد: تو اب کیا ہوگا؟

مرزا غالب: (سر اٹھا کر) یوسف جسمانی طور پر تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس ذہنی لحاظ سے بیمار ہے۔ میرا خیال ہے کہ معقول علاج سے وہ ٹھیک ہو سکتا ہے۔

ہمزاد: تو پھر کیوں نہیں کراتے اُس کا علاج؟ دلّی کے بڑے بڑے حکیموں سے تمہارے تعلقات ہیں۔

**مرزا غالب:** لیکن علاج کے لیے کافی روپیہ درکار ہوگا۔ میرے پاس کہیں سے روپیہ آ جائے تو میں سب سے پہلے یہی کام کروں گا۔

**ہمزاد:** لیکن روپیہ حاصل کرنے کے لیے تمہیں ہی کچھ کرنا ہوگا۔

**مرزا غالب:** اس لیے تو میں فیروز پور جھرکہ آیا ہوا ہوں اور اس تگ و دو میں ہوں کہ نواب احمد بخش خاں سے اپنی خاندانی پنشن والا مسئلہ حل کرا لوں تاکہ میرے کئی مسئلے حل ہو جائیں (سرد آہ بھر کر) جب میں دہلی سے نکلا تھا تو یوسف شدید بخار میں مبتلا تھا اور مسلسل چیخ رہا تھا۔ اگر مہاجنوں نے تقاضے کر کر کے میرا جینا دوبھر نہ کر دیا ہوتا تو میں اپنے بھائی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر یہاں ہرگز نہیں آتا۔

**ہمزاد:** تمہیں یہاں آئے ہوئے بہت دن گزر چکے ہیں۔ اب تک تو کچھ بھی نہیں ہوا۔

**مرزا غالب:** سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟

**ہمزاد:** (طنزیہ لہجے میں) سمجھ میں کیا آئے گا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم بھی اپنے بھائی کے رستے چلنے لگے ہو۔ اسد اللہ خاں یاد رکھو اگر تم نے موجودہ حالات سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تو یوسف کی طرح تم بھی دیوانے ہو جاؤ گے۔

**مرزا غالب:** تیرے منہ میں خاک۔ کیا واہی تباہی بک رہا ہے؟

**ہمزاد:** حقیقت بتا رہا ہوں۔ ذرا یہ تو کہو کہ تم یہاں فیروز پور جھرکہ کس لیے آئے تھے؟

**مرزا غالب:** اپنی خاندانی پنشن کا مسئلہ حل کرانے۔

**ہمزاد:** اب یہ بتاؤ کہ اتنے عرصے تک یہاں رہ کر تم نے ایک مثنوی اور چند غزلیں لکھنے کے سوا کیا کام کیا ہے۔ اپنی زندگی کا سب سے اہم کام چھوڑ کر شعر و شاعری میں مصروف ہو گئے کیا یہ دیوانوں جیسی بات نہیں ہے؟

**مرزا غالب:** تمہیں معلوم ہے اس مثنوی میں کیا ہے؟

**ہمزاد:** ایک دلچسپ کہانی ہے اور کیا ہے۔ اس کے ذریعے تم نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ آدمی چاہے جتنی بھی کوشش کر لے اس کا مقدر نہیں بدل سکتا۔ یہ کم ہمتی اور مایوسی کی بات ہے۔ مثنوی ہو یا غزل سب تمہاری ذہنی عیاشی کا نمونہ ہے۔ ان میں کچھ بھی نہیں دو کوڑی کی چیزیں ہیں یہ سب۔

**مرزا غالب:** (ذرا اک دم غصّے میں آ کر اس پر برس پڑتے ہیں) تم جاہل ہو۔ کم عقل اور بدتمیز ہو۔ شاعری میرا فن ہے، میری زندگی ہے اور تم اسے عیاشی کہہ رہے ہو۔ نالایق' کمینے' جاہل۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ (میز پر سے کٹورہ اٹھا کر اس کی طرف پھینکتے ہیں۔ ہمزاد پھرتی کے ساتھ اس کی زد سے بچ کے بھاگ نکلتا ہے۔ کٹورہ فرش پر گرنے کی آواز کچھ لمحوں تک گونج رہتی ہے۔ مرزا غالب اپنا سر پکڑ کر بیٹھے رہتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں)

**مرزا غالب:** دماغ خراب کر دیا کم بخت نے۔ میرا خیر خواہ بن کر آیا تھا لیکن ہمدردی اور غمگساری کی بجائے طعنے تشنے دینے اور مجھے نصیحت کرنے لگا، اگلی بار آ کر تو دیکھے میرے سامنے...

(کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دیتی ہے۔ مرزا غالب چونک جاتے ہیں)

.....مرغے کی بانگ سنائی دے رہی ہے۔ صبح ہو گئی ہے۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ساری رات فکروں' پریشانیوں اور خواب میں گزر گئی۔ اب دن خدا جانے کون سی پریشانیاں لے کر آیا ہوگا۔ (مرغے کی آواز پھر سنائی دیتی ہے) صبح ہو گئی... ارے ہاں یاد آیا۔ آج تو رائے چھجمل آنے والا ہے۔ کل رات ہی وہ دلّی سے یہاں اپنی بہن کے گھر آیا ہے۔ آتے ہی اس نے کہلا بھیجا ہے کہ مجھ سے ملنے کی لیے کل آئے گا۔ چھجمل میرا ایسا دوست ہے جس سے میں اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں۔ اس سے مشورہ بھی کر سکتا ہوں اور کچھ نہیں تو اس سے باتیں کر کے جی تو ہلکا ہو ہی جائے گا۔ (بستر پر دراز ہوتے ہوئے) اب مجھے کچھ دیر کے لیے سو جانا چاہیے لیٹ کر چادر اوڑھ لیتے ہیں)

(رفتہ رفتہ اندھیرا ہو جاتا ہے)

☆☆☆

# تبصرے

☆ تبصرے کیلئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔
☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔
☆ تبصرے کے لیے ارسال کی جارہی کتاب کے سرورق کی تصویر ای میل سے بھیجیں۔
☆ تبصرے کے لیے تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں۔
☆ کتاب کسی بھی صورت میں واپس نہیں کی جائے گی۔

**نام کتاب: جہاتِ سرسید**

مصنف : ڈاکٹر شمس بدایونی
ضخامت : 120 صفحات
قیمت :250 روپے
ناشر : براؤن پبلی کیشنز، نئی دہلی 110025
ملنے کا پتہ :براؤن بک پبلی کیشنز، قلعہ روڈ شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
مبصر : **ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب**

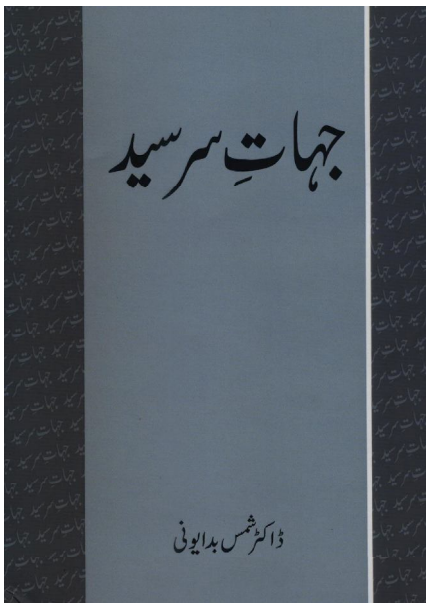


اس کتاب کی ترتیب اس طور پر ہے۔ پیش گفتار از مصنف، حرفے چند از پروفیسر اصغر عباس، تعارف از پروفیسر شافع قدوائی۔ ان کے بعد پانچ مضامین ہیں۔ (1) تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف (2) سرسید کے خطابات (3) مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ (4) کتاب فقرات یعنی صد پند فارسی (5) سرسید کے مجموعہ ہائے خطوط۔ ان مضامین کے بعد اشاریہ، کتابیات اور سرسید کے تعلق سے عکسی نوادر ہیں۔ آخر میں مصنف کی تصنیف کردہ 25 کتب کی فہرست شامل کی گئی ہے۔

ڈاکٹر شمس بدایونی نے پیش گفتار (ص5 تا7) میں جہات سرسید کی تالیف کی ضرورت اور مقصد پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا کہ سرسید کا مطالعہ انیسویں صدی کے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کا مطالعہ ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ اُن کی شخصیت پر اعلیٰ ترین تحقیق کا فریضہ انجام نہیں دیا گیا۔ مذکورہ بالا پانچ مضامین سرسید کو موضوع تحقیق بنا کر پیش کرنے کی کوشش ہے تا کہ تاریخی ورثہ محفوظ رہے۔

زیر نظر کتاب میں شامل مقالات اس قابل ہیں کہ ان پر فرداً فرداً گفتگو کی جائے لیکن صفحات کی تنگ دامانی مجھے اجازت نہیں دیتی کہ میں تفصیل سے ان پر اظہار خیال کروں۔ لیکن ان پر اظہارِ خیال کے بغیر کتاب پر با معنی گفتگو بے معنی ہوگی۔

تجاویز سرسید اور تاریخ رموز اوقاف: ڈاکٹر شمس نے تحریر کیا ''رموز اوقاف کی تعیین اور اُن کے استعمال کو رواج دینے میں سرسید احمد خاں پہلے بزرگ ہیں لیکن اس سلسلے میں اُن کی خدمات کا صحیح ترین جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ (ص37) لہٰذا اس مضمون میں ڈاکٹر شمس نے سرسید کی کوشش کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ رموز اوقاف کی سلسلہ وار تاریخ مرتب ہوگئی ہے۔ اس مضمون کو بالاستیعاب پڑھنے کے بعد ہی ڈاکٹر شمس کی موضوع پر گرفت اور تجزیاتی پیش کش کی داد دی جاسکتی ہے۔

سرسید کے خطابات: ''یہ دوسرا مضمون ہے جس میں ڈاکٹر شمس نے جملہ خطابات کو جو سرسید کو مغل دربار اور انگریزی حکومت کی طرف سے عطا کیے گئے تھے، ان کی تفصیل دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ پیش کردی ہے۔ خطابات کے سلسلے میں سرسید پر انگریزوں کی وفاداری کے جو الزام لگائے گئے، ان کا رد بھی کیا ہے اور باور کرایا ہے کہ یہ خطابات نہیں بھی ملتے تو سرسید کی عبقری شخصیت برقرار رہتی۔ بقول پروفیسر شافع قدوائی: ''یہ مضمون بلا شبہ سرسید کی سوانحی توضیحات سے متعلق ایک تشنہ گوشے کی تکمیل کرتا ہے۔'' (ص:12)

چوتھے مضمون کا عنوان ہے ''کتاب فقرات یعنی صد پند فارسی'' سرسید نے مراد آباد میں صدر الصدور کے ایام میں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا تھا جس کے نصاب تعلیم کے لیے مذکورہ بالا کتاب مرتب کی تھی۔ ڈاکٹر شمس نے پہلی بار اس کتاب کو متعارف کرایا ہے۔ یہ کتاب صد پند لقمان کے طرز پر ہے جس میں سو فقرات بزبان فارسی شامل کیے گئے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ بھی درج کردیا گیا ہے۔

سرسید کے کمیاب مجموعہ ہائے خطوط: یہ پانچواں مضمون ہے۔ ڈاکٹر شمس نے مطلع کیا کہ ''زیر نظر مضمون میں سرسید کے چند کمیاب اور نایاب مجموعہ ہائے خطوط کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔ (ص8) اس مضمون میں متداول مجموعہ ہائے خطوط کو صرف نظر کر کے صرف ان مکاتیب کے مجموعوں پر گفتگو کو محدود رکھا گیا ہے جو غیر متداول ہیں۔ (ص:79) اس مضمون میں بھی ڈاکٹر شمس نے اپنی جانفشانی کا ثبوت دیتے ہوئے غیر متداول خطوطِ سرسید کی تاریخی اہمیت اور ان کے ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون سے سرسید کی عبقری شخصیت اور ان کے حکیمانہ وقائدانہ کردار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جہات سرسید کے تعارف نگار پروفیسر شافع قدوائی کی رائے ہے کہ:

''غرض کہ تمام مضامین تحقیقی دقت نظری کا قابل قدر نمونہ پیش کرتے ہیں اور سرسید فہمی کی ایک نئی روایت کی آبیاری کرتے ہیں۔'' (ص:12)

صفحہ 100 پر سرسید کی کتب اور رسائل وغیرہ کے نوادر کا عکس باصرہ نواز ہوتا ہے۔ یہ عکسی نوادر ڈاکٹر شمس کی تلاش اور سرسید کی علمی وادبی جہات کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر شمس بدایونی کی 25 مطبوعہ کتب کا اندراج ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کو شامل کرنے کے بعد یہ تعداد 26 ہوجاتی ہے۔ بدایوں کی صدہا سال قدیم تہذیب کے دور حاضر میں ڈاکٹر حنیف نقوی کی وفات (12 دسمبر 2012 سہسوان بدایوں) کے بعد ڈاکٹر شمس ہی معروف محقق نظر آتے ہیں۔

کتاب دیدہ زیب شائع ہوئی ہے۔ امید ہے اس کی پذیرائی علیگ برادری کے علاوہ اردو ادب کے عالم گیر ماحول میں ہوگی۔

**نام کتاب :مجتبیٰ حسین اور فن طنزو مزاح نگاری**

مصنف : ڈاکٹر گل رعنا
ضخامت : 244 صفحات
قیمت : 300 روپے
ناشر : انداز پبلی کیشنز ایریزونا، یو۔ایس۔اے
**مبصر : صدر عالم گوہر**
فون :7715980144

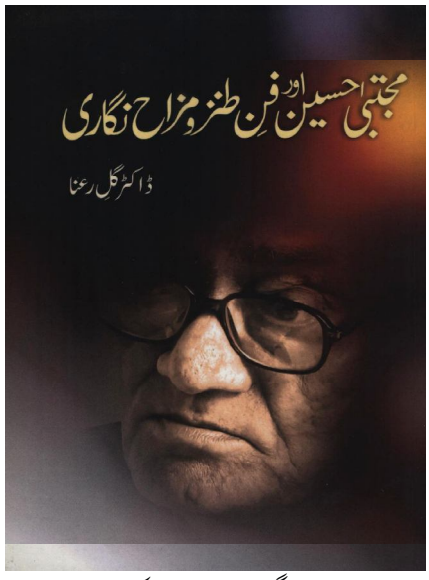


ہماری زندگی میں طنز ومزاح کی بڑی اہمیت ہے ۔طنز ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کا کام کرتی ہے اور مزاح ہماری زندگی میں مسکراہٹ بکھیرتا ہے۔دونوں کی ہماری زندگی میں اشد ضرورت ہے۔طنز ومزاح کی تعریف دانشوروں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے اور دونوں کو زندگی کے اہم عناصر میں شامل کیا ہے۔ایک مہذب معاشرے میں طنز ومزاح کو اہم مانا گیا ہے۔طنز ومزاح ہمارے یہاں مغرب سے آئی ہے۔مغرب میں Humour and satire کو معاشرے کا اہم حصہ ہے۔

گل رعنا ایک ذہین ریسرچ اسکالر ہیں ۔انہوں نے بہت ہی سوچ سمجھ کر مجتبیٰ حسین کا انتخاب کیا ہے اور ان پر اپنا تحقیقی کام کیا ہے۔زیر نظر کتاب مجتبیٰ حسین اور فن طنز ومزاح نگاری ان کی عمدہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

یہ کتاب اہم دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔اس کو انہوں نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہیں۔

باب اول: طنز ومزاح کی تعریف، باب دوم: طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش، باب سوم: مجتبیٰ حسین کے حالات زندگی، خاندان، تعلیم، ادبی سرگرمیاں اور ملازمت باب چہارم۔مجتبیٰ حسین کی طنز ومزاح نگاری، مضمون نگاری میں طنز و مزاح کی چاشنی، خاکہ نگاری میں طنز و مزاح کے نقوش، کالم نگاری میں طنز ومزاح کی جھلکیاں، سفرناموں میں طنز ومزاح کے نشتر، باب پنجم۔مجتبیٰ حسین اور ان کے ہم عصر مزاح نگاروں کی تحریروں میں مماثلت، جس میں ڈاکٹر گل رعنا نے مرزا فرحت اللہ بیگ، ابن انشاء، کنہیا لال کپور، مشتاق احمد یوسفی، فکر تونسوی اور یوسف ناظم جیسے معتبر طنز ومزاح نگاروں کی تحریروں میں مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، باب ششم: اس باب میں جو موضوعات شامل ہیں وہ اس طرح ہیں۔مجتبیٰ حسین کا فن ناقدین کی نظر میں، اختتامیہ اور کتابیات۔

زیر تبصرہ کتاب مجتبیٰ حسین اور فن طنز ومزاح نگاری کے مطالعے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی سے اس کتاب کو مکمل کیا ہے۔مجتبیٰ حسین کی زندگی کے سارے حصوں کو انہوں نے اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔جو اس کی فہرست سے پتہ چلتا ہے۔

کتاب کے چند اقتباس کو دیکھیں جو مجتبیٰ حسین کی کتابوں سے ڈاکٹر گل رعنا نے منتخب کیا ہے۔

(۱) مرزا دعوت علی بیگ ایک ایسا کردار ہے جس کی زندگی کا مقصد کھانا اور صرف کھانا ہے۔مرزا دعوت علی بیگ مع اپنی بیوی کے کسی دعوت میں بن بلائے مہمان کے طور پر جانے پر بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

اس حرکت پر انہیں کئی مرتبہ بے عزت کر کے نکالا بھی گیا لیکن مرزا دعوت علی بیگ مزیدار کھانوں کے شوقین تھے اور مرتے دم تک ان کی نیت نہیں بھری تھی۔

ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

مرزا ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خود اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودی۔گور کنوں تک کو زحمت نہ دی۔ جب ان کا آخری وقت آیا تو مجھے بلوا بھیجا۔ڈاکٹروں نے مرغن کھانوں سے پرہیز بتایا تھا مگر مرزا کی روح تو نہاری میں اٹکی ہوئی تھی۔مجھ سے راز دارانہ انداز میں بولے ''بھیا! یہ ڈاکٹر لوگ تو اپنے پیٹ کے لئے دوسروں کا پیٹ کاٹتے ہیں۔میں پرہیز کے ساتھ مرنے کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔میری یہ خواہش ہے کہ آپ کل صبح مجھے نہاری کھلائیں ۔میں چپ چاپ آپ کو دعا دیتا ہوا اس دنیا سے نکل جاؤں گا۔'' اس وقت مجھے مرزا کی آنکھوں میں نہاری کے ذائقہ کی جھلک صاف دکھائی دے گئی۔دوسرے دن میں ان کی خواہش کے احترام میں نہاری لے گیا۔تو زبان سے کچھ نہ کہا چپ چاپ نہاری کھائی اور آنکھیں بند کر کے جو لیٹے تو پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔یہ ان کی آخری دعوت تھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۲) علامہ نارسا کا کردار ایسے شعراء کی نمائندگی کرتا ہے جو راہ گیروں تک کو اپنا کلام سنانے میں خوشی اور اطمینان محسوس کرتے ہیں چاہے سننے والا بیزار ہی کیوں نہ ہو جائے۔علامہ نارسا جب مشاعروں میں کلام سنانے جاتے تو ہوٹنگ ہوتی لیکن علامہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ اس کا پر لطف بیان مجتبیٰ حسین نے یوں کیا ہے۔

''مگر افسوس کہ علامہ کے کلام سنانے کا یہی انداز بالآخر ان کی موت کا سبب بنا اور وہ شاعری کی راہ میں شہید ہو گئے۔ہوا یوں کہ ایک شعر میں ''قتل'' کا تذکرہ تھا۔چنانچہ علامہ نے قتل کا سماں باندھنے کے لئے اپنی جیب سے استرا نکالا اور آن کی آن میں اسے اپنے گلے پر پھیر لیا۔علامہ کی لاش اسٹیج پر تڑپنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علامہ کی روح ''قفس عنصری'' کا تالا توڑ کر پرواز کر گئی۔اب علامہ ہم میں نہیں رہے جس پر جتنی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے۔زندگی بھر علامہ کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ علامہ ایسے مہلک اشعار نہ کہئے جن سے آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں مگر وہ نہ مانے اور گذشتہ پیر کو شاعری کے میدان میں شعر پڑھتے پڑھتے شہید ہو گئے''

یہ کتاب مجتبیٰ حسین کی ساری زندگی کا احاطہ کرتی ہے اور مجتبیٰ حسین کی ساری اہم واقفیت اس کتاب میں شامل ہے۔جو آئندہ کے مجتبیٰ حسین پر کام کرنے والوں کے لئے کارگر ثابت ہوگی۔

**نام کتاب:حریف تیرگی**

مصنف : ڈاکٹر لاڈلے رہبر
ضخامت : 240 صفحات
قیمت : 300 روپے
ناشر : سادات امروہہ، ویلفیئر آرگنائزیشن، دہلی
**مبصر : تابش مہدی**
**فون : 09818327947**

ڈاکٹر لاڈلے رہبر سرزمین مصحفی امروہہ کے ایک خوش فکر اور خوش کلام سخنور ہیں۔وہ شاعری کی مختلف اصناف پر قدرت رکھتے ہیں اور جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں سامع یا قاری کو یہی احساس ہوتا ہے کہ وہ اسی میدان کے مرد ہیں۔میں نے انہیں نعت ومناقب اور سلام کی محفلوں

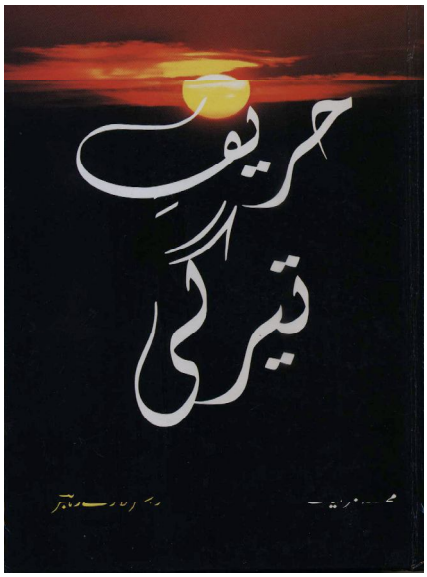


میں بھی دیکھا ہے اور سنا ہے اور غزلیہ و بہاریہ محفلوں میں بھی۔وہ جہاں اور جس محفل میں بھی شریک ہوتے ہیں سامعین بڑی توجہ سے انہیں سنتے اور داد وتحسین سے نوازتے ہیں۔ان کا یہ رنگ میں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب وہ اپنی شاعری کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔وہ جتنا اچھا کہتے ہیں اتنا ہی اچھا پڑھتے بھی ہیں ان کی اس خوبی نے انہیں غیر معمولی مقبولیت وہر دلعزیزی عطا کردی ہے۔

زیر نظر کتاب ''حریفِ تیرگی'' رہبر امروہوی کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔کتاب کے نام حریفِ تیرگی سے ان کی شاعری کی بھی سمت کا تعین ہوتا ہے اور ان کی زندگی کے مقصد اور رخ کا بھی۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر برائے شعر کے قائل نہیں ہیں۔وہ تفریح یا تفنن طبع کے طور پر شاعری نہیں کرتے بلکہ ان کے سامنے زندگی کا ایک عظیم مقصد ہے اور ان کی شاعری ان کے اسی مقصد عظیم کی ترجمانی کرتی ہے۔حریف تیرگی میں جہاں اس طرح کے اشعار ملتے ہیں طبیعت وجد میں آجاتی ہے۔

ہرگز نہیں ہے لقمۂ تر کی ہوس مجھے
اے رب دو جہاں مجھے رزقِ حلال دے

جو بڑھ کے موت کی آنکھوں میں ڈال دے آنکھیں
وہ کون شخص ہے وہ کون سا گھرانا ہے

یہ بات خوب سمجھ لیں بلندیوں والے
زمین والے بھی کچھ آسمان ہوتے ہیں

لقمۂ تر کے بجائے اپنے خالق ومالک سے رزق حلال کی طلب کرنا۔موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والے مقدس گھرانے کی تلاش وجستجو۔آسماں جیسی بلندی رکھنے والوں کو زمین والوں کی رفعت وبلندی کا احساس دلانا۔سورج سے آنکھیں ملانے والوں کی رفعت وبلندی کا احساس دلانا۔سورج سے آنکھیں ملانے والوں کے انجام سے آگاہ کرنا اور ظالم کی بیعت اور جی حضوری سے انکار کے باوجود معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کا احساس، یہ سب وہ باتیں ہیں جو کسی شاعر یا سخنور کو عظمت وبلندی عطا کرتی ہیں۔ان سے اس کی سمتِ سفر کا یقین ہوتا ہے اور مقصد زندگی کا بھی۔

ڈاکٹر لاڈلے رہبر امروہے کے اس شعری وادبی حلقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں الفاظ ومعانی اور محاوروں وروزمرہ کی رعایت ان کی پوری روایات واقدار کے ساتھ کی جاتی ہے۔انہوں نے وہاں کے بزرگان شعروادب سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔انہوں نے مولانا سید محمد عبادت کلیم امروہوی، علامہ شہباز امروہوی، حکیم کلب شاہد امروہوی، سیفی امروہوی، تاباں نقوی جیسے اساطین فن اور ماہرین زبان وبیان کی مجلسیں دیکھی ہیں اور ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر شعر کہنے اور لفظ ومعنیٰ کو برتنے کا ہنر سیکھا ہے۔ان کے اشعار پڑھ کر یا سن کر اچھی، بڑی اور صاف ستھری شاعری کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ہاں روایت کا بھی پورا احترام ملتا ہے اور نئی شعری قدروں کا بھی۔یہی ایک اچھی شاعری کی پہچان ہے۔ان کے اس قسم کے اشعار سے ان کا پورا ذخیرۂ سخن لبریز ہے۔

خنجر بتا یہ تجھ سے ہمارا سوال ہے
کس کے گلے نے کند کیا تیری دھار کو

یوں تو تمہاری اینٹ کا پتھر جواب تھا
حائل فقط بزرگوں کی دستار ہوگئی

میں رہبر امروہوی کی خدمت میں اس اچھی اور پرمقصد شاعری پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ان کی کتاب ''حریفِ تیرگی'' کا خیر مقدم کرتا ہوں اور انہی کے اس شعر پر اپنی گفتگو کا اختتام کرتا ہوں:

ٹمٹماتے وہ دیے جو تھے حریفِ تیرگی
ان دیوں کی روشنی کا آیئے چرچا کریں

**نام کتاب : بوجھ سکھی ری بوجھ**

شاعر : فراغ روہوی
ضخامت : 200 صفحات
قیمت : 200 روپے
ناشر : گلستاں پبلی کیشنز
مبصر : **صدر عالم گوہر**

بہت سی اصناف ایسی ہیں جن پر بہت ہی کم توجہ دی جارہی ہے۔کہہ مکرنی بھی ایسی ہی ایک صنف ہے

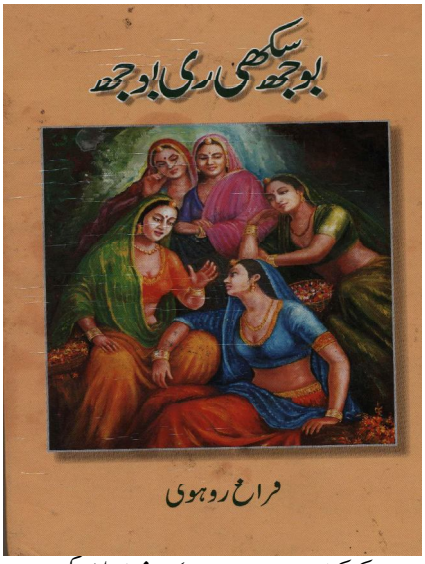


جس پر کم کم لکھا جا رہا ہے۔کہ مکرنی ،پہیلی کو کبھی بڑی مقبولیت حاصل تھی۔عوام میں اس کا استعمال خوب خوب ہوتا تھا۔کہہ مکرنی اور پہیلی سے لوگ لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔وقت کے ساتھ لوگوں کی پسند ناپسند میں تبدیلی آتی گئی اور بعد میں اسے بچوں اور عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔امیر خسرو نے عوام میں اسے مقبولیت بخشی اور کہہ مکرنی ایک بہت ہی مقبول صنف کے طور پر جانی پہچانی گئی۔انہوں نے ہر موضوع پر کہہ مکرنیاں لکھی ہیں۔امیر خسرو نے بڑی خوبصورتی سے غیر مسلموں میں بھی ہونے والی رسموں اور رواجوں کو جگہ دی۔جس سے وہ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ غیر مسلموں میں بھی بڑے مقبول رہے۔انہوں نے اپنی کہہ مکرنی میں پورے ہندوستان کو سمولیا۔اور ان کی کہہ مکرنی عوام میں کافی مقبول ہوئی۔ان کی کہہ مکرنیاں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔ہمیں آج بھی امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں پڑھ کر لطف آتا ہے۔اس صنف کو اور آگے بڑھایا جانا چاہئے اور اس صنف میں نئے نئے تجربے کرنے چاہئیں۔

فراغ روہوی کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔انہوں نے بہت سی شعری اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔جس میں غزل،نظم،دوہے،ماہیے،حمد،نعت،رباعیات،شاعری برائے اطفال اور کہہ مکرنی۔زیر تبصرہ کتاب بوجھ سکھی ری بوجھ کہہ مکرنیوں کا مجموعہ ہے۔اس میں انہوں نے کہہ مکرنی پر طبع آزمائی کی ہے۔اور کہہ مکرنی کو عصری تقاضوں سے آراستہ کیا ہے۔وہ اپنی کہہ مکرنیوں میں عصر حاضر میں رونما ہونے والے واقعات،حالات اور ایجادات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ساری کتاب میں موضوعات کا

تنوع ہے۔انہوں نے کوشش کی ہے کہ اکثر موضوعات کو کہہ مکرنی میں پیش کیا جائے جس میں وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔چند کہہ مکرنیاں مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔آپ ان کہہ مکرنی کو دیکھیں۔ناقد ہندی، کرامات جیسے موضوع پر چند کہہ مکرنیاں۔

آسرا سب کو دینے والا
سب کی نیا کھینے والا
صرف وہی ہے جہاں پناہ
کا سکھی مانجھی
نا سکھی اللہ

وہ کب ہو جاتے ہیں پرکٹ
پھر بھی مزاروں ہے جمگھٹ
ہے ممکن ولیوں کی بدولت
کا سکھی جادو؟
ناری کرامت

امیر خسرو کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے فراغ روہوی نے جہاں اللہ، رسول، عقیدہ، اذان، روزہ، رمضان، امام، عید، محرم جیسے موضوعات کو اپنی کہہ مکرنی میں پیش کیا ہے وہیں غیر مسلموں کے عقیدے کو بھی اپنی کہہ مکرنی میں پیش کیا ہے وہیں غیر مسلموں کے عقیدے کو بھی اپنی کہہ مکرنی میں جگہ دی ہے۔

پیشے سے متعلق کہہ مکرنی بھی کتاب میں شامل ہے۔چند پیشے کو دیکھیں۔تیلی، درزی، دھنیا، دھوبی، موچی، کباڑ، چور، جلاد، مواری، جوکر، مداری، سنار، لالا، بیٹھ، ناقد، درویش، جوگی وغیرہ اور ان کے متعلق کہہ مکرنی دیکھیں۔

سچا ہو تو حسن دکھائے
جھوٹا خالی پیٹ گے بائے
اچھے کم ہیں زیادہ حاسد
کا سکھی دوست؟
نا سکھی ناقد

عربی ہے نا ایرانی
یہ بھاشا ہے ہندوستانی
اس میں بسی ہے ہند کی خوشبو
کا سکھی ہندی ؟
نا سکھی اردو

فراغ روہوی کی یہ کاوش قابل تحسین ہے۔اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہئے اور یہ کتاب کہہ مکرنی کی روایت میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

**نام کتاب : بولتے الفاظ**

شاعر : ابوالخیر نشتر
ضخامت : 160 صفحات
قیمت : 150 روپے
تقسیم کار : کتاب منزل، جنگی مسجد، بتیا، بہار
**مبصر : ابوظہیر ربانی**
فون : 9958587464

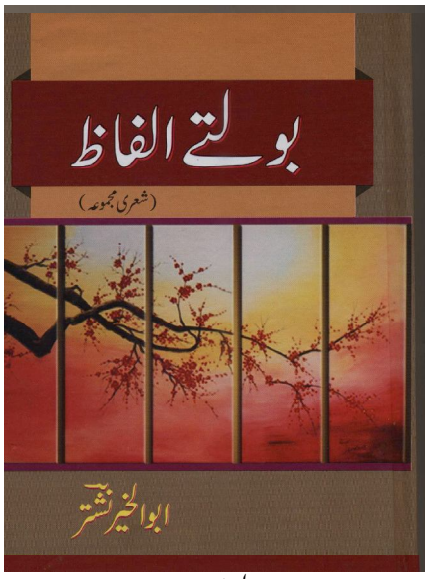


'بولتے الفاظ' ابوالخیر نشتر کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔اس سے قبل دو شعری مجموعے 'الفاظ کی خوشبو' اور 'لفظ لفظ آئینہ' منظر عام پر آ چکے ہیں۔'بولتے الفاظ' میں بیشتر نظمیں ہیں نیز 32 غزلیں بھی ہیں۔علاوہ ازیں قطعات بھی شامل ہیں۔

نشتر نے بھی اپنے آس پاس کے ماحول سے موضوعات اخذ کیے ہیں لیکن اس میدان میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔نشتر نے بے باکی کے ساتھ سماج اور سیاست کے گھناؤنے، مکروہ چہرے، اخلاقی گراوٹ، مذہب کے نام پر دہشت گردی، انسانی قدروں کی پامالی، انسانی خود غرضی، عیاشی جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

مجموعہ میں پابند، آزاد اور معریٰ نظمیں شامل ہیں۔ایسی نظموں میں ٹوٹتے لمحے، کرب آشنا، ایک سوال، وہی فنکار، مزدور کا مقدر، نوائے وقت، یہی جمہوریت ہے، خوش شناس، شاخ بریدہ، خوش منظری کا خوف، شہر ارتقا کے نام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ابوالخیر نشتر کی نظموں میں انسان کی گم ہوتی ہوئی شناخت کے المیے کا احساس شدت کے ساتھ موجود ہے، جو قاری کے ذہن کو جھنجھوڑتا ہے۔ان کی شاعری میں احتجاج کے لیے تو سنائی دیتی ہے مگر یہ احتجاج کے لیے شعری محاسن پر غالب نہیں ہو پاتی۔موجودہ صورت حال پر دو مختلف نظموں کے چند ٹکڑے ملاحظہ کیجئے:

پتھروں کے شہر میں/ میں نے دیکھا/ خونچکاں منظر/ ذہن کی دہلیز پر/ رقصاں ہے، میرے/ ایک سوال!
کون ہے اس شہر کا خالق/ بتا؟ اے وقت کے.....تازہ خدا
(ایک سوال)

مندرجہ بالا نظموں کے ٹکڑوں کو پڑھ کر نشتر کی فکر اور سوچ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، مجموعہ میں شامل نظمیں مثلاً شہیدان وطن، مزدور کا مقدر، عجیب منظر ہے، یہی جمہوریت ہے؟ اور ٹوٹتے ہوئے لمحے، ترقی پسندوں کی یاد دلاتی ہیں۔پابند نظموں میں نوائے وقت، ہمارا عہد، لا الٰہ الا اللہ، نظر اقبال، یادوں کی لکیر، یاد حسین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔بعض نظمیں حب الوطنی کے جذبے سے متاثر ہیں تو بعض قوم وملت کا درد جگاتی ہیں۔تاثراتی نظمیں پابند نظموں کے زمرے میں آتی ہیں۔کتاب میں قطعات بھی شامل ہیں جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔

مجموعہ کا دوسرا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔کہا جاتا ہے کہ ہر خیال کو نظم کیا جاسکتا ہے لیکن ہر خیال سے اچھی شاعری نہیں کی جاسکتی، نشتر کے مجموعۂ غزلیات ''لفظ لفظ آئینہ'' کا یہ شعر اس ضمن میں بڑی اہمیت رکھتا ہے:

کسب پیہم سے ملا ہے لفظ و معنی کا شعور
مدتوں کے بعد نشتر شاعری اچھی لگی

ابوالخیر نشتر سنجیدہ اور حساس شاعر ہیں، ان کی شاعری میں انسانی رواداری اور انسانی اقدار کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔وہ ظالم، جابر اور خود غرض جیسے افراد کو آئینہ دکھانا چاہتے ہیں۔مجموعہ کے مطالعے سے شاعر کا اصل جوہر اور مقصد زندگی کھل کر سامنے آتا ہے، نشتر ظالم کے سامنے سر جھکانا نہیں چاہتے وہ انسان کے اندر ہمت اور حوصلہ دیکھنا چاہتے ہیں۔امید ہے کہ ادبی حلقے میں شعری مجموعہ 'بولتے الفاظ' کو خاطر خواہی پذیرائی حاصل ہوگی۔

☆☆☆

# مراسلات

● 'آجکل' کا دسمبر 2018 کا شمارہ بغور پڑھا۔ جگن ناتھ آزاد کے بارے میں اداریہ کے علاوہ شہباز حسین اور پروفیسر شہزاد انجم کے مضامین کافی معلوماتی تھے۔ جگن ناتھ آزاد کافی عرصہ تک جموں وکشمیر میں رہے۔ جب وہ سری نگر کے پریس انفارمیشن بیورو میں ڈی پی آئی او تھے تو مجھے ان کے ساتھ کچھ عرصہ تک کام کرنے کا موقع ملا۔ میں یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کرنے کے بعد ریڈیو کشمیر جایا کرتا تھا۔ وہاں آزاد صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے جوان دنوں اقبال اور مغربی مفکرین کی ترتیب میں لگے ہوئے تھے مجھے اپنے مضامین کو جو جلدی میں لکھے گئے تھے اور عام آدمی ان کو ٹھیک سے پڑھ نہیں سکتا تھا نقلیں اتارنے کا کام سونپ دیا۔ کام کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب اور اقبال کے فکر وفن پر بھی باتیں ہوتی تھیں۔ وہ بڑے اچھے زبان داں تھے۔ ایک بار میں نے ان سے کہا کہ اگر 'انیس' (مرثیہ نگار میر ببر علی کا تخلص) اُنس سے ماخوذ ہے تو یہ 'انیس' کیوں نہیں ہے؟

وہ یہ سن کر برہم ہوئے لیکن چائے پینے کے بعد مجھے تفصیل سے بتایا کہ الفاظ جب اسم سے فعل یا صفت کا روپ دھارتے ہیں تو ''اعراب میں تبدیلی آجاتی ہے'' اس سلسلے میں انہوں نے 'حسن' اور 'حسین' وغیرہ کی مثالیں دیں۔ اقبال کے بارے میں بات کرتے ہوئے میں نے ایک بار کہا کہ اقبال کوئی فلسفی نہیں ہیں بلکہ انہیں مفکر شاعر کہا جاسکتا ہے۔ اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے میں نے کہا کہ کون سا مربوط فلسفہ ان کے کلام میں موجود ہے اور اسے کیا نام دیا جاسکتا ہے نیز اس اسکول کو کن فلسفیوں نے آگے بڑھایا ہے یا بڑھا سکتے ہیں؟

میں ایک نوجوان تھا اور ادب میں نووارد، تاہم آزاد نے میری بات بغور سنی اور کہا کہ اس لحاظ سے تو ''ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی فلسفی نہیں مانے جاتے۔ آپ کی بات میں وزن ہے لیکن میں فیصلہ صادر نہیں کرسکتا۔''

جاوید نامہ اور 'ڈوائین کامیڈی' کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا کہ جہاں دانتے نے اپنے آسمانی سفر میں پیغمبر اسلامؐ اور خلیفہ راشد حضرت علیؓ کے بارے میں بات کرتے ہوئے گستاخی سے کام لیا ہے وہاں اقبال نے رواداری اور شرافت زبان کو اختیار کیا ہے۔

''اقبال اور مغربی مفکرین'' پر انہوں نے تو کافی جاں فشانی سے کام کیا لیکن میں نے جب اس کتاب کو بعد میں پڑھا تو مجھے (جیسے مغربی ادب اور فلسفے سے خاصی شناسائی ہے) اس میں وہ گہرائی اور گیرائی نظر نہیں آئی۔ جس کا تقاضا اس کا موضوع کرتا ہے۔

اتفاق کی بات ہے جب جگن ناتھ آزاد پی آئی بی اور جموں یونیورسٹی سے فارغ ہوکر جموں میں مقیم تھے تو میں سرینگر کے اسی پی آئی بی دفتر میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھا۔ ایک دن گاندھی نگر جموں میں، جہاں وہ سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ کافی خوش ہوئے اور دیر تک مشفقانہ انداز سے باتیں کیں۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ ہم سے جدا ہوئے۔ انہیں اپنے آبائی وطن سے کافی لگاؤ تھا اور اس لیے پاکستان سے بھی۔ وہ کشمیر کو راولپنڈی کا بدل سمجھتے تھے اور لاہور کی بڑی تعریفیں کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے قائل تھے اور اردو تاریخ کی ایک زندہ مثال تھے لیکن اس کے باوجود (فکری تقاضا ہے) ان کے دل میں برصغیر کی تقسیم اور ترک وطن کے حوالے سے کافی تلخی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ترانہ لکھنے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد بھی لاہور میں ہی رہنا چاہتے تھے لیکن حالات اس قدر بدل گئے کہ ایسا کرنا ممکن ہی نہ رہا۔

اردو جگن ناتھ آزاد کی روزی روٹی اور ان کا اوڑھنا بچھونا تھی لیکن کیا جگن ناتھ آزاد نے بھی اردو کے کئی دیگر شاعروں، ادیبوں اور شیدائیوں کی طرح اپنے بچوں کو اس زبان سے بالکل نابلد رکھا یا انہیں کم از کم اس کی بنیادی جان پہچان بہم کرائی۔ مجھے اس کی پوری واقفیت نہیں۔

**محمد یوسف گنائی**
68، توی وہار، جموں

● دسمبر کا شمارہ 'آجکل' نظر نواز ہوا۔ میری نظم نذر مرزا غالب شامل کرنے کے لیے بطور خاص شکریہ۔ گزشتہ ماہ آپ

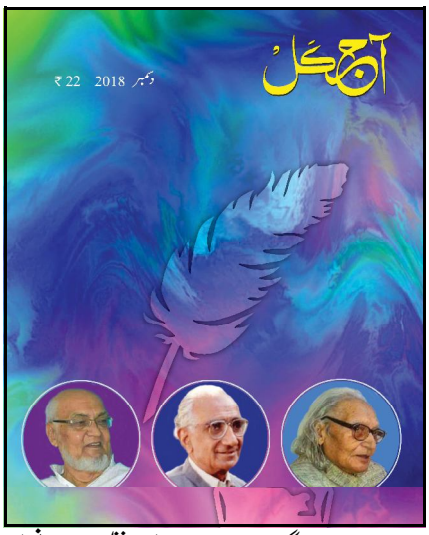


سے ملاقات کا خوشگوار اثر دل پر رہا۔ مذکورہ نظم غالب انسٹی ٹیوٹ کو ارسال کرنے کا ذکر بھی شاید میں نے کر دیا تھا۔ ویسے تو ان کو آپ کے مذکورہ رسالہ سے علم ہو چکا ہوگا۔ ویسے اصولاً بھی خود ان کو خبر کرنے جا رہا ہوں، تاکہ وہاں شائع نہ ہو۔ حسب دستور اس شمارہ میں بھی 'غبار کارواں' کے عنوان سے ماضی کے ادب کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کے ادب وغیرہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا۔ خصوصاً جگن ناتھ آزاد سے متعلق شہباز صاحب اور شہزاد انجم دونوں کے مضامین خاصہ معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے پچاس کی دہائی میں ایک بار بلکہ شاید آخری بار ہمارے شہر گیا کے سب سے بڑے گیا کالج کے بڑے شاندار کالج میں بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیے گئے تھے اور وہ طرحی مشاعرہ تھا۔ پورا مصرع ذہن میں ابھی نہیں ہے لیکن قافیہ ''یہاں، وہاں، کہاں'' اور ردیف 'رکھ دی' اچھی طرح یاد ہے۔ میں آئی اے کا طالب علم تھا۔ اس کے پہلے سے باقاعدہ غزلیں کہنا میں نے شروع کر دی تھیں۔ جگن ناتھ آزاد بی ایچ یو (بنارس) کے مشاعرے سے شرکت کرتے ہوئے گیا پہنچے تھے۔ گیا شہر کے عالمی شہرت یافتہ بزرگ شاعر عزیز کابری کے مشاعرے کے صدر تھے۔ جگن ناتھ آزاد نے مسلسل شہر اور بے حد مصروفیت کی بنا پر مصرع طرح میں غزل پیش کرنے سے معذرت کر لی اور تقسیم ہند پر اپنی مشہور زمانہ نظم سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ مشاعرہ کے اختتام پر دستور کے مطابق مہمان خصوصی اور جناب صدر کو دوبارہ کلام پیش کرنے کی گزارش کی گئی۔ جناب صدر عزیز کابری جو پہلے طرحی غزل اپنی سنا چکے تھے۔ دوبارہ مہمان خصوصی سے مخاطب ہو کر اس طرح میں چند اشعار ان کی خدمت میں پیش کیے۔ دو ایک اشعار فی الحال مجھے یاد نہیں ملاحظہ ہوں: ''جو پرساد کی چڑھائی تھی وہاں کاشی کے مندر میں۔ رہی پس خوردہ وشنو پد کے چرنوں میں رکھ دی''؟

''جو پہلی بار آئے تھے نیا کچھ تحفہ لانا، یہ باسی کھیر تم نے لا کے پیش مہمان رکھ دی۔'' جگن ناتھ آزاد اتنا متاثر ہوئے کہ اٹھ کر سریر صاحب کو گلے لگالیا۔ اور کہا'' مجھے آج معلوم ہوا کہ گیا کی سرزمین اس قدر زرخیز ہے۔'' راشد صاحب نے قاضی صاحب کے حوالہ سے بڑا سیر حاصل مضمون لکھا ہے اور کئی باتیں جو پردۂ خفا میں تھیں اسے افشا کر دیا۔ جب وہ پٹنہ اردو اکادمی تشریف لائے تھے تو ان کی شان میں ناچیز نے استقبالیہ نظم پڑھی تھی۔

**حسن نواب حسن**

محلّہ ہارون نگر، سیکٹر 2، مکان نمبر 305/2 پٹنہ

● آپ حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی ادب نوازی کے جذبے کے تحت مجھے دسمبر 2018 کا آجکل کا شمارہ بذریعۂ ڈاک بھیجا ہے۔ اس میں اپنا ایک مضمون ''محمد عبداللہ تبت بقال صوفیانہ موسیقی کے استاذ'' دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ آپ کی وسیع القلبی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

سالہا سال سے 'آجکل' اردو رسالہ نکال کر آپ اردو کے بہی خواہوں میں ضرور شامل کیے جائیں گے۔ یہ رسالہ پابندی کے ساتھ ہر منظر عام پر آرہا ہے۔ مضامین کی اہمیت اور افادیت کو دیکھ کو آپ اردو زبان و ادب کو قائم و دائم رکھنے کے لیے ایک اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ قلم کاروں کی مختلف نوعیت کی تخلیقات، افسانے، تبصرے، مکتوبات، منظومات وغیرہ قابل مطالعہ ہوتے ہیں۔ اس رسالے کا اداریہ بہت ہی صحت مند ہوتا ہے۔ آجکل کی فائل سے لیے گئے پرانے مضامین پڑھنے والوں کو زمانۂ ماضی کی یادیں دلاتے ہیں اور جہاں فانی سے رفتہ ادیبوں کی تخلیقات بہت ہی معلومات افزا ہوتی ہیں۔ جزاک اللہ۔ خدا کرے زور قلم اور بھی زیادہ۔

**مرزا بشیر احمد شاکر**

شہجار کالونی، منڈی بل، سری نگر، کشمیر

● سب سے پہلے شہباز حسین صاحب کا شکریہ، جن کے توسل سے مرحوم جگن ناتھ آزاد کے بارے میں پڑھنے کو ملیں۔ ان کی وطن پرستی اور اردو کے لئے کی گئی کوشش کو سلام۔ جس طرح آزاد جی نے مرحوم محمد اقبال کی اہمیت کو سمجھا، جانا اور ہندوستان میں انھیں مقام دلایا۔ اس سے ان کی علامہ اقبال سے دلچسپی اور اردو سے بے انتہا محبت کا پتا چلتا ہے۔ اس کاوش کے لئے اردو ادب (ہندوستان) ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔ آزاد صاحب کی نظم ہی ان کی سوچ و فکر، خیالات اور دلی طبیعت کا پتا دیتی ہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کے صرف نظم نگار ہی نہ تھے بلکہ اعلیٰ قدروں کے انسان بھی تھے۔ ان کی نظم کا یہ شعر جو اس رسالے میں درج ہے ان کو نظم نگاروں کے صف اول میں شمار کرنے کے لئے کافی ہے۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانند مہمان لے کے آیا ہوں

حسن ضیاء صاحب کا اداریہ بھی اپنے اندر ڈھیر ساری معلومات کو بیاں کرتا ہے۔

**ڈاکٹر شریف احمد خاں**

امبیڈکر نگر۔ یوپی

● 'آجکل' کا تازہ شمارہ ملا شکریہ۔ آجکل تو ایک مکمل ادبی رسالہ ہے جس میں ہر ایک تخلیق قابلِ مطالعہ ہوتی ہے۔ مضامین، افسانے، تبصرے، خطوط سبھی کالم لاجواب ہیں۔ اس شمارے میں آپ کا اداریہ پسند آیا۔ آپ نے سبھی زبانوں سے متعلق معلوماتی اداریہ لکھا ہے۔ آج ہم اردو زبان کو چھوڑ کر خاص طور پر انگریزی زبان کی طرف بھاگے جارہے ہیں اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان ہر ملک میں ایک جانی مانی زبان بن چکی ہے، لیکن جو مٹھاس، شیرینی ہمیں اردو زبان میں دیکھنے کو ملتی ہے وہ کسی زبان میں ہو ہی نہیں سکتی۔ مضامین میں کے۔ کے کھلر کا ہندوستانی فیسٹیولس پر اچھا مضمون ہے اور یہ ہمارے لئے ایک ناز کی بات ہے کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں diversity بہت نمایاں ہے۔ ہمارا ہندوستان دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں سارے تہوار ساتھ مل کر منائے جاتے ہیں اور سبھی festivals کا احترام کیا جاتا ہے ورنہ تو غیر ممالک میں لوگ اتنے زیادہ مصروف ہیں کہ انہیں وقت کی کمی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر نصرین بیگم کا میکش پر مضمون معلوماتی ہے۔ ڈاکٹر عبدلحئی کا ہمارے میزائل مین اے پی جے عبدلکلام پر یہ مضمون اس شمارے کی جان ہے۔ ڈاکٹر اے پی جے کلام ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جنہوں نے اپنے dedication سے بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ وہ ایک سائنس داں کے ساتھ ساتھ مشہور ادیب بھی تھے۔ ان کی کتاب "the inspiration of life" میں نے پوری تو نہیں پڑھی، لیکن جتنی بھی پڑھی اسے پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ان کا انداز منفرد تھا۔ عبدالحئی نے بھی یہ مضمون کو بہت دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے اور یہ مضمون پڑھ کر مجھے ان کا ایک قول یاد آتا ہے...

"IT IS EASY TO DEFEAT SOMEONE,BUT IT IS DIFFICULT TO WIN SOMEONE"

فہمیدہ ریاض پر لکھے گئے سارے مضامین اچھے لگے خاص طور پر خالد اشرف پسند آئے۔ افسانوں میں شموئل احمد کا افسانہ 'احمق' اچھا لگا اور نثار راہی کا افسانہ 'منشی مرغوب' بھی خوب ہے۔ اس افسانے میں 'سلیم' کے کردار کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ تبصروں کی ایک الگ ہی دنیا ہے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔

**استوتی اگروال**

اگروال جیولرز (سرونج، مدھیہ پردیش)

● سال نو 2019 اور موسم بہار کی آمد کی پرخلوص مبارکباد! 'آجکل' اردو کی تمام تر عمدہ مشمولات سے دو تین ماہ کے وقفے پر مستفیض ہو جاتی ہوں کہ اول تو آپ نے زرسالانہ ارسال کرنے کے بعد بھی میری کاپی ہر ماہ کالج کے پتے پر بھیجنا ترک کر دیا ہے، دوم آزاد کتاب گھر، ساکچی جمشید پور سے بروقت دستیاب نہیں ہو پاتا، اس لیے معذرت خواہ ہوں کہ فوری طور پر اپنے تاثرات رسالے کے مشمولات کے متعلق ارسال نہیں کر پاتی۔ بہرحال اپنے پسندیدہ رسالے سے بروقت لطف اندوز نہ ہونے کا دلی قلق ہے اور رہے گا۔

**ڈاکٹر رضوانہ ارم**

صدر شعبۂ اردو، جمشید پور، وومن کالج، جمشید پور

ادھر کچھ سالوں سے ہمارے ملک میں جس تیزی سے ہمارے اپنے ہی لوگوں کے ذریعہ اردو رسم الخط کو الوداع کہا جارہا ہے اس کے پیش نظر وہ دن زیادہ دور نہیں رہ گئے ہیں کہ پورا اردو ادب دیوناگری رسم الخط میں تبدیل ہو جائے اور اس کے پڑھنے والے اس زبان کو پورے طور سے ہندی زبان کا درجہ دے دیں۔

مشاعرہ ہو یا یوم اردو یا دیگر اردو سے جڑے ادبی پروگرام، جو مقام اسٹیج پر یا بینر پر اردو رسم الخط میں نہیں ہوتا جو ہمارے لیے بڑے شرم کی بات ہے۔ رسم الخط ہی اردو زبان کی روح ہے۔ جس دن آپ نے اس روح کو اردو سے الگ کر دیا اس دن اردو بے جان ہو کر اپنی موت آپ مر جائے گی اور اس کی ساری شیرینی جاتی رہے گی۔ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک اردو محض اپنی شیریں زبان کی وجہ سے ہر خاص و عام میں مقبول رہی ہے۔ اس شیرینی میں نقطہ (بندی) کو بڑا دخل رہا ہے۔

ان حالات میں مشاعروں اور تقریبات کے منتظمین حضرات سے میری دردمندانہ اپیل ہے کہ خدارا مشاعروں میں لگے بینر پر اردو رسم الخط کو اس کا جائز مقام دیں اور صرف اردو شعرا کو ہی مدعو کریں۔

**محمد منتصر عباسی**، نظام پور، گورکھپور

یہاں بھی مرزا صاحب نے وہی تیر سے تراشا ہوا قلم استعمال کیا ممکن ہے کہ مذکورہ بالا دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہوں۔ مگر جہاں تک قرآن کو قران نظم کرنے کا تعلق ہے یہ الزام امیر خسرو پر نہ سہی امیر ناصر خسرو پر عائد ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

بر جامہ سخن باش جز معنی آستر نیست
چوں پند باش پندے جز در قراں مگر نیست

منوچہری نے بھی میرزا صاحب کے برخلاف ایک شعر میں قُران باندھا ہے وہ لکھتا ہے:

خسرو تنہ ملک بود اودلۂ ملک
ملکت چو قُران، او چو معانی قُران است

حکیم سنائی ان دونوں سے بھی اونچے درجے کے شاعر ہیں۔ ان کے ایک ہی قصیدے کے دو شعر پڑھیے:

رسن داوت ز قرآن تاز چاہ تن بروں آئی
کہ فرمودت رسن بازی زراہ دیو نفسانی
یکے خوانیست پُر نعمت قُراں بہر غذائے جاں
ولیکن چوں تو بیماری، نیابی طعم مہمانی

دیکھیے پہلے شعر میں سنائی نے قُرآں کو بتلفظ اصلی باندھا ہے، اور دوسرے شعر میں اسی لفظ کو بروزنِ پُران نظم کر دیا ہے۔ حکیم قطران تبریزی نے بھی اس شعر میں مرزا صاحب کے علی الرغم قُران ہی باندھا ہے:

روش روشن ہمچو آتش، سرش تیرہ ہمچو دود
شخص او دروست جود و علم او بر دل قران

یہی شاعر ایک اور مدحیہ قصیدے میں لکھتا ہے:

ہیچ عیبے نیست در پاکیزہ طبع او پدید
لفظ او بے عیب و بامعنی بکردارِ قُراں

ابو منصور ملان کی مدح میں اپنے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے:

گرچہ شعرم دُر بود، چوں در مدیح او بود
مردم دانا قریں دانند اور رابا قُراں

یہ عرض کردوں کہ مذکورہ بالا اساتذہ قرآن کے صحیح تلفظ سے واقف تھے۔ چنانچہ ان کے دواوین میں زیادہ تر درست تلفظ ہی ملتا ہے اور اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لوگ از راہ جہالت قرآن کو قُراں نظم کر گئے ہیں۔ اگر مرزا صاحب زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جاتا کہ حضرت ناصر خسرو، حکیم سنائی اور قطران تبریزی کے بارے میں کیا ارشاد ہے کیا یہ بھی 'خران نامستحق' ہی قرار پائیں گے؟

اصل بات یہ ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہو، اس کے لیے قواعد وضوابط کی تدوین وترویج آہستہ آہستہ اور بتدریج ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدما کے یہاں زیادہ متوسطین کے یہاں کم اور متاخرین کے کلام میں کمتر لفظی ڈھیل نظر آتی ہے۔ چنانچہ اردو میں یہی ہوا ہے۔ ولی سے داغ | وامیرا تک پہنچتے پہنچتے سیکڑوں لفظوں کی ہیئت بدل گئی اور دہائیوں الفاظ متروک قرار دے دیے گئے اس لیے کسو، کبھو، ایدھر اودھر، جاوے اور آوے وغیرہ الفاظ کسی شعر میں پائے جائیں تو وہ گدھے کا کلام نہ ہوگا۔ کسی متقدم استاد ہی کا ہوگا۔ ☆☆

('آجکل' مارچ 1972)

## حامدی کاشمیری

# غزل

میں روز وشب کے لبادے کو تار تار کروں
ہوا کے پار پگھلتے وجود کو دیکھوں

تم اپنے جسم کو نشے میں بے لباس کرو
میں زہر نائی احساس کو ذرا بھولوں

زمیں سے پھوٹے، پھلے پھولے، گر کے خاک ہوئے
میں اپنے خون سے پیڑوں کی داستان لکھوں

میں اپنے شہر میں گھر گھر نہ پاسکا خود کو
دیارِ غیر میں تجھ کو کہاں کہاں ڈھونڈوں

یہ چاندنی مجھے پاگل بنا کے دم لے گی
میں گھر میں کاندھوں پہ صحرا اٹھا کے لایا ہوں

تمہارے روپ میں میرا لہو پکارے گا
میں شوخ رنگ میں کچھ تو سیاہیاں گھولوں

('آجکل' فروری 1972)

## پبلی کیشنز ڈویژن کی مطبوعات اور رسائل وجرائد حاصل کرنے کے پتے

●پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، **نئی دہلی**-3 (24365610)●701، سی ونگ، کینڈریہ سدن، بیلا پور، **نوی ممبئی**-14 (27570686)●8 ایسپلینیڈ ایسٹ، **کولکاتا**-69 (22488030)●اے ونگ، راجہ جی بھون، بسنت نگر، **چنئی**-90 (24917673)●پریس روڈ، نزد گورنمنٹ پریس، **ترواننت پورم**-1 (2330650)●بلاک نمبر 4 فرسٹ فلور، گروکلپ کمپلیکس ایم جی روڈ، ناملی، **حیدر آباد**-1 (24605383)●فرسٹ فلور، ایف ونگ، کینڈریہ سدن، کورامنگلا، **بنگلور**-34 (25537244)●بہار اسٹیٹ کوآپریٹیو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، **پٹنہ**-4 (2301823)●ہال نمبر 1، سیکنڈ فلور، کینڈریہ بھون، سیکٹر H، علی گنج، **لکھنؤ**-24 (2325455)

# اردو ایک سیکولر زبان

**اردو** کے نام پر جس بڑے پیمانے پر مختلف قسم کے وی آئی پی پروگرام ہو رہے ہیں اس سے اگر ہمیں خوشی ہوتی ہے تو اس میں کوئی غلط بھی نہیں۔ ہماری خوشی اس وقت اور بھی دوبالا ہو جاتی ہے جب ہم اس سراب کو حقیقت میں بدلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ آج بھی اردو بولنے والے اور اسے برتنے والے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی ہیں اور سکھ عیسائی بھی اور اسے صرف مسلمانوں کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات ببانگ دہل کہی جا سکتی ہے کہ اردو سب سے زیادہ سیکولر زبان ہے۔ ریختہ فاؤنڈیشن کے سنجیو صراف نے جس قدر اردو اور اردو والوں کی خدمت کی ہے یا یوں کہہ لیں کہ اسے سجایا، سنوارا اور چمکایا ہے بہ الفاظ دیگر اردو کی عزت افزائی کی ہے وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ اس سے کہیں زیادہ اردو نے انہیں نوازا ہے۔ کیا خوب سودا نقد ہے اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔ مطلب یہ کہ اردو آج بھی سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ اردو زبان اپنے مزاج کے اعتبار سے دنیا کی سبھی زبانوں میں نرم رفتار اور شیریں گفتار ہے۔ اسے بولنے اور برتنے والے پیار کرتے ہی ہیں، مخالفین بھی اسے رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور حاسدین جل جل مرتے ہیں۔ ریختہ فاؤنڈیشن نے اپنے خوبصورت پروگراموں کی پیش کش کے سبب عام عوام اور اردو والوں کے دل جیت لیے ہیں۔

ریختہ نے جس طرح بعض ختم ہوتے ہوئے اصناف کو زندہ کیا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے۔ خاص طور پر ان میں بیت بازی، چہار بیت، داستان گوئی اور قوالی کو جس طرح پیش کیا ہے، اس سے زبان اردو کو ہمت اور طاقت ملی ہے۔ سنجیو صراف جو کچھ سوچتے ہیں اسے عملی جامہ بھی پہناتے ہیں۔ خاص طور پر اردو زبان کے تعلق سے۔ ہر سال صراف صاحب پورے جوش وخروش اور جذبہ کے ساتھ اردو کی گنگا جمنی تہذیب وثقافت کو ایک نئی سج دھج کے ساتھ پیش کرتے ہیں یہ انہی کا حصہ ہے اور اب یہ سنجیو صراف کی شناخت بن چکا ہے۔ ریختہ فاؤنڈیشن نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اس سے لوگ کافی متاثر ہوئے ہیں۔ اپنے کارناموں کی فہرست میں ریختہ فاؤنڈیشن کے تحت گزشتہ دنوں 'فرہنگ قافیہ' لانچ کیا جانا شامل ہے، جس سے اردو شاعری کی دنیا میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ صرف ایک کلک میں سیکڑوں، ہزاروں ممکنہ قافیے آپ کے سامنے کمپیوٹر کے مانیٹر پر دست بستہ نظر آنے لگتا ہے، جن شاعروں کا قافیہ تنگ ہے، سنجیو صراف کی اس فرہنگ قافیہ سے نہ صرف ان کی پریشانی دور ہوگی لیکن بہت سے متشاعر قسم کے لوگ بھی اس فرہنگ قافیہ کی مدد سے تک بندی کر کے بزعم خود شاعر بے بدل کہلانے کی جگت میں لگ جائیں گے۔

اردو کی ایک بے لوث خادمہ کا منا پرساد جو بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں جگدیش پور کی رہنے والی ہیں۔ جہاں مشاعرہ پابندی سے ہوا کرتا تھا۔ کا منا پرساد کو آج بھی جب اس چھوٹے سے گاؤں کی خوشبو یاد آتی ہے تو وہ اپنے ماضی میں کھو جاتی ہیں۔ ان حسین یادوں کو آج بھی وہ نہیں بھول پائی ہیں۔ ان یادوں کو برقرار رکھنے کے لیے وہ تقریباً گزشتہ 20 برسوں سے دہلی جیسے شہر میں ایک عالمی پیمانے کا مشاعرہ جشن نو بہار ٹرسٹ کے زیر اہتمام پورے جوش وخروش سے منعقد کرتی رہی ہیں۔

معزز قارئین! آج ہمارا موضوع اردو کے ہندو شعرا اور ادبا ہے لیکن بخوف طوالت ہم اسے صرف ہندو تک محدود رکھتے ہیں۔ یعنی دور حاضر میں اردو کے غیر مسلم ادیب وشاعر۔ ہماری گفتگو کا دائرہ زیادہ پھیلنے نہ پائے لہٰذا ہم ایسے ادیب وشاعر جو بعض اوقات اجتماعی اور بعض اوقات اپنے انفرادی کارنامہ کے سبب جانے جاتے ہیں اور اب تک ایسے اردو ادیب ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اپنی اردو دوستی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ سچائی محفوظ ہے۔ ایک زمانے تک ڈی سی ایم اور شنکر شاد کا مشاعرہ آج بھی لوگوں کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔

اردو روز اول سے ہی سیکولر اور جمہوریت پسند رہی ہے۔ کیا مسلمان اور کیا ہندو، کیا سکھ اور عیسائی اکثریت کی زبان آج بھی اردو ہے۔ لیکن آج چند ناعاقبت اندیش لوگ اس خوشگوار ماحول میں زہر گھولنے کا کام کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہمارا ماحول آلودہ ہوتا ہے اور جانوں کا زیاں بھی ہوتا ہے۔ اردو نے دلوں پر حکومت کی ہے اور عوامی فلاح وبہبود کے متعدد کام کیے ہیں۔ آج دیوندر اسر، آنند لہر، جگن ناتھ آزاد، شباب للت ان جیسے اور بہت سے ادیب وشاعر نے دلوں کو جوڑنے کا کام کیا ہے۔ معاصر منظر نامے میں گوپی چند نارنگ، رتن سنگھ، نارنگ ساقی، نند کشور وکرم، اویناش امن، ٹی آر رینا، سریواستوا رند، ڈاکٹر نریش اور ان جیسے بہت سے ایسے ادیب وشاعر ہیں جنہوں نے اردو کو سینے سے لگائے رکھا ہے۔ یہ سبھی اپنی اپنی بساط بھر تخلیقات ونگارشات سے اردو کے ذخیرے کو مالا مال کر رہے ہیں۔ کچھ اور ناموں میں، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی آج بھی 90 سال کی عمر میں اپنی سیکولر ذہنیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر سال رمضان میں ایک روزۂ رواداری رکھتے ہیں اور شام میں بہت سے مسلمان اور ہندو ان کے ساتھ روزہ کھولتے ہیں۔ یہ بھی ہماری تہذیب وثقافت کی دین ہے۔ ادھر ممبئی میں مقیم گلزار جن کا اصل نام سمپورن سنگھ کالرا ہے، یہ دونوں اپنے نام عرصہ ہوا بھول چکے ہیں اور اب وہ صرف گلزار کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اس گیت میں بظاہر اپنی معشوقہ کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ جب اپنی معشوقہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کی زبان کو 'اردو کی طرح' بتاتے ہیں تو اس پورے گیت میں اردو کی فطرت اور حسن کو آشکار کرتے ہیں۔ گلزار خواہ دہلی کے ہوں یا ممبئی کے عرصہ ہوا اپنے اپنے ماضی میں تعصب وتنگ نظری کو گم کر دیا ہے یا پھر انہیں مذہبی صندوقوں میں بند کر آئے ہیں۔ جہاں تک پروفیسر صاحب کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ اپنے حلقہ بگوشوں کو ہمیشہ نوازتے رہے ہیں۔ اردو کے ایک خاص حلقے کو انہوں نے عزت بخشی ہے۔ یہ تو ہوئی اوپری اور ظاہری باتیں اگر ذرا سنجیدگی سے غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاملہ خوش کن نہیں ہے بلکہ شاید اس کے برعکس ہے۔

ایک طرف جہاں ہم مشاعروں اور اردو کے میلے ٹھیلے اور دوسرے وی آئی پی قسم کے پروگرام کو دیکھ کر اور سن کر خوش ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اردو ترقی کر رہی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ چیزیں محض نمائشی ہیں اصلی اور بنیادی کام یہ ہے کہ ہم اسکولوں میں ابتدائی درجات سے لے کر ہائی اسکول تک اردو پڑھنے پڑھانے کے سلسلے کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی کوشش اور جدوجہد کو تیز کریں تبھی ہم اپنی پیاری زبان اردو کو بچا سکیں گے اور تبھی ان مشاعروں، اردو کے سمیناروں، بیت بازی، چہار بیت، داستان گوئی اور اردو کے دوسرے متعلقات کو بھی برقرار رکھ سکیں گے اور ان پروگراموں کا مزہ لے سکیں گے۔ حرف آخر کے طور پر کہتا چلوں کہ پانی پیڑ پودوں کی جڑ میں ڈالیے، پھول پتیوں پر پانی چھڑکنے سے کچھ نہیں ہونے والا۔

**ابرار رحمانی**

آجکل کی فائل سے:

# کچھ غالب سے متعلق

## امتیاز علی عرشی

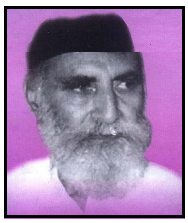



**غالب** کی ایک فارسی رباعی ہے:

غالب، بہ گہر ز دودۂ زادشمیم
زاں روبہ صفائی دمِ تیغ است دمم
چوں رفت سپہبدی، زدم چنگ بہ شعر
شد تیرِ شکستۂ نیاگاں قلمم

غالب کے فارسی اور اردو کلام نظم ونثر کا مطالعہ کرنے والے بخوبی واقف ہیں کہ اس رباعی میں انہوں نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ میرا قلم باپ دادا کے ٹوٹے ہوئے تیر سے بنایا گیا ہے، بالکل درست ہے۔ وہ جب کسی کے خلاف کچھ لکھتے ہیں تو ان کا شکار ان کے اس شعر کا مصداق ہوتا ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کسی معترض نے کہہ دیا ہوگا کہ فلاں شعر میں آپ کو فلاں شاعر سے توارد ہو گیا ہے۔ زادشم کے پوتے سے یہ بات کیسے برداشت ہوتی۔ قلم دان میں سے وہی تیر سے تراشا ہوا قلم نکالا اور اس کے دل ودماغ کو برمادیا۔ فرماتے ہیں:

زرفتگاں بیکے گر توارد م روداد
مداں کہ خوبی آرائش غزل بُردست
مراست ننگ ولے فخر اوست کان بسخن
بسعی فکر رسا، جابداں محل بُردست
میر گمانِ توارد، یقیں شناس کہ دُزد
متاعِ من زنہاں خانہ، ازل بُردست

دیکھا آپ نے توارد کے اعتراض پر کیا تیر باری کی ہے۔ معترض ہی نہیں، وہ استاد بھی شکار ہو گیا، جس کا مضمون بقول معترض میرزا صاحب نے نظم کر دیا تھا۔

کسی امیر سے ناراض ہو کر اس کی ہجو میں یہاں تک کہہ گزرے کہ:

بتو ہرگز نداد مے زروسیم
خواجہ، گربود مے خدای تومن

ایک دشمن کی مذمت میں فرماتے ہیں:

بیتے از استاد دیدم، ذوق کے بخشید لیک
ہیچ در تسکین نیفزود وحشت کم نکرد
''ہجو تو ناقابلے درصلب آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نکرد''
حاشاللہ، بودنت درصلبِ آدم تہمت است
پیش ہرکس گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

ہجو و مذمت کی حد ہو گئی۔ کیا تیر اس سے گہرا زخم کرتا۔ خیر یہ تو نظم کے کچھ شعر تھے اور نظم میں مبالغہ ہوا ہی کرتا ہے۔ میرزا صاحب نثر میں بھی اسی قدر تیز وتند تھے۔ قاطع برہان میں محمد حسین تبریزی کو جو کچھ کہا ہے، وہ کیا کم تھا کہ اس سلسلے میں انہوں نے اِدھر اُدھر جو خط لکھے، ان میں دوسرے فرہنگ نویسوں کو بھی بری طرح زخمی کر دیا۔ بے چارے ملا غیاث الدین نے فارسی لغات جمع کر کے ماخذ کے حوالوں کے ساتھ عربی وفارسی کے نصابی کتابوں میں مستعمل الفاظ کی ایک فرہنگ مرتب کر دی تھی۔ قبول عام خداداد بات ہوتی ہے اسے وہ شہرت نصیب ہوئی کہ باید وشاید۔ میرزا صاحب نے اس غریب کو بھی نہ چھوڑا اور ایک خط میں لکھا کہ: غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا، ناقل ناعاقل۔'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''غیاث اللغات ایک نام موقر ومعزز، جیسے الفربہ خواہ مخواہ مردِ آدمی۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ، رامپور کا رہنے والا۔ فارسی سے نا آشنائے محض اور صرف ونحو میں ناتمام۔ انشای خلیفہ ومنشیات مادھورام کا پڑھانے والا۔''

مرزا تفتہ کو اسی غیاث اللغات کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''میں برہان کا خاکہ اڑا رہا ہوں۔ چار شربت اور غیاث اللغات کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں۔ ایسے گمنام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا؟''

صاحب عالم مارہروی کو لکھا ہے:

''اگر قائل تحقیق ہو تو میرے بیان پر غور کرو اور جو عبدالواسع اور غیاث الدین اور عبدالرزاق ان ناموں کی شوکت نظر میں ہے، تو تم جانو۔ ایک شخص بھیک مانگتا ہے۔ باپ نے اس کا نام میر بادشاہ رکھ دیا ہے۔ اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ماعلیہ، نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رامپور نے کھو دیا۔ ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں، جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں، خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خران نامشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ، نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے، اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے۔''

قتیل اور غیاث الدین فارسی اور عربی کتنی جانتے تھے۔ اس کا حال مصحفی کی عقد ثریا اور حافظ احمد علی خاں شوق کے تذکرے کاملان رام پور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ قتیل مرزا محمد باقر شہید اصفہانی کی تربیت میں رہا تھا اور غیاث الدین جسے مرزا صاحب خرنا مشخص قرار دے رہے ہیں، نواب یوسف علی خاں بہادر اور نواب کلب علی خاں بہادر والیانِ رامپور کا استاد تھا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا، دراصل تمہید ہے۔ اصل مقصد یہ کہنا ہے کہ مرزا صاحب نے مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب کو لکھا ہے:

''تم علاء الدین خاں کو لکھو کہ بڑی شرم کی بات ہے کہ ہر دم آزردگی غیر سبب را چہ علاج، اس غزل کو حافظ کی غزل سمجھتے ہو۔ واہ، واہ۔ غیر سبب کہاں کی بولی ہے؟

از خواندن قرآن تو، قاری، چہ فائدہ؟ عیاذ اُ باللہ! امیر خسرو قرآن کو کہ بہ سکون رای قرشت والف ممدودہ ہے قران بروزن پُران لکھیں گے؟

یہ دونوں غزلیں دو گدھوں کی ہیں۔ شاید ایک نے مقطع میں حافظ اور ایک نے مقطع میں خسرو لکھ دیا ہو۔''

باقی صفحہ 53 پر

# کتب موصولہ

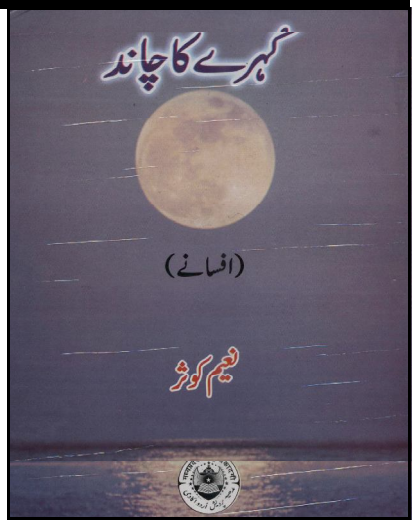


**کہرے کا چاند** مصنف: نعیم کوثر
ناشر: مصنف، بھوپال

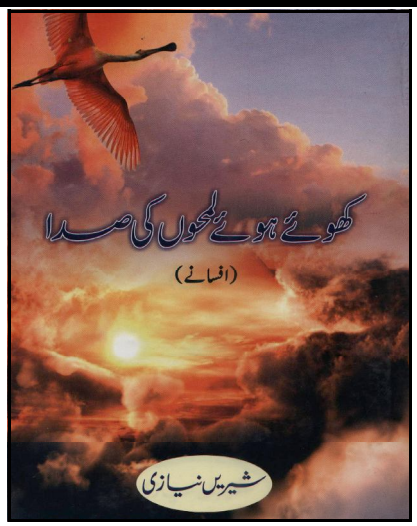


**کھوئے ہوئے لمحوں کی صدا** مصنف: شیریں نیازی
ناشر: ظہیر نیازی، ریور سائڈ، بھرکنڈا، رام گڑھ

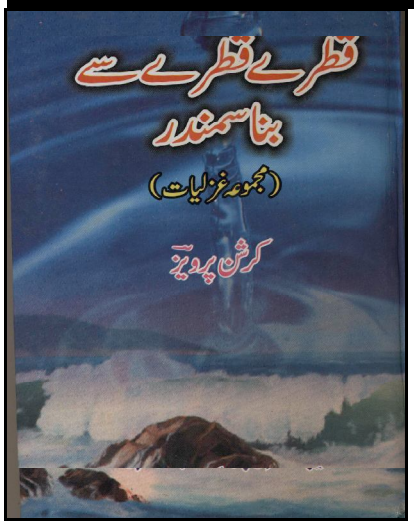


**قطرے قطرے سے بنا سمندر** مصنف کرشن پرویز
ناشر: 26۔فرینڈز انکلیو، چنڈی گڑھ روڈ، کھرڑ (روپڑ)

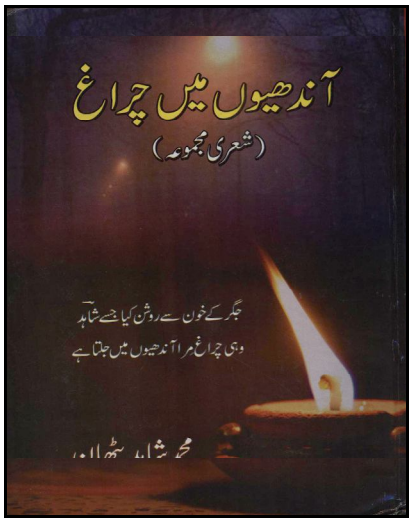


**آندھیوں میں چراغ** مصنف: محمد شاہد پٹھان
ناشر: مصنف، جے پور (راجستھان)

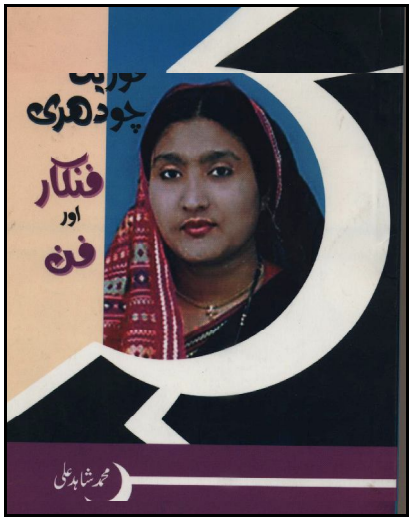


**فوزیہ چودھری فنکار اور فن** مصنف: محمد شاہد علی
ناشر: تنویر پبلشرز، حیدرآباد

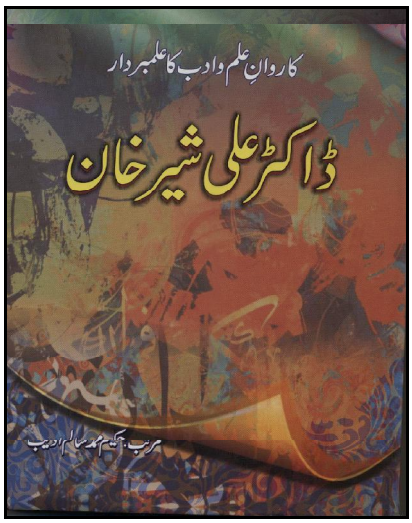


**ڈاکٹر علی شیر خان** مرتب: حکیم محمد سالم ادیب
ناشر: مولانا آزاد لائبریری، ڈرائیور کوارٹر، کانٹاپوکھر، کولکاتا

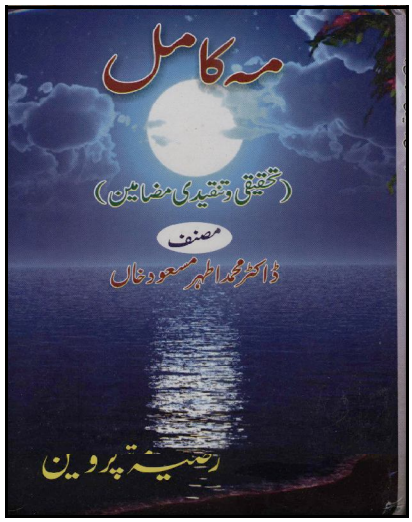


**مہ کامل** مصنف: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
ناشر: غوث منزل، تالاب ملا رام، رامپور۔244901

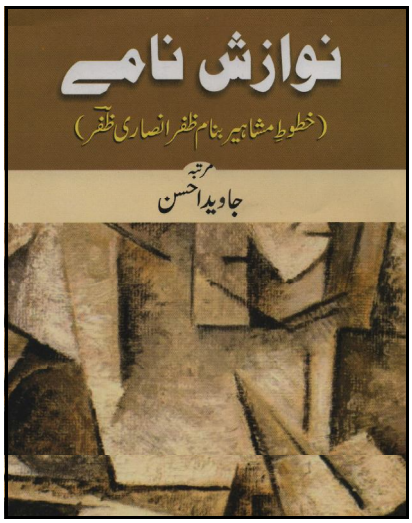


**نوازش نامے** مرتبہ: جاوید احسن
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

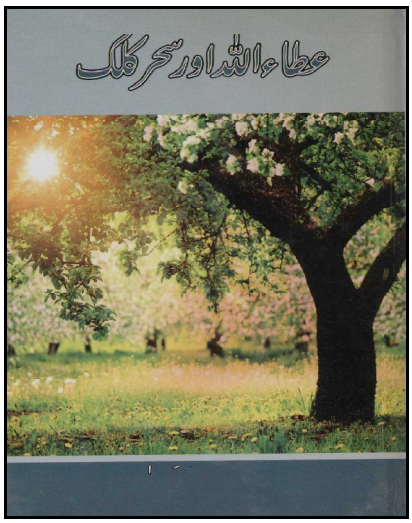


**عطاء اللہ اور سحر کلک** مرتب: شبر امام
ناشر: ادارہ حسینی سماج، پالی کالونی، پٹنہ۔800008

Regd.No. D.L. (S)05/3198/2018-20
RNI No 948/57 (Delhi Post)
Date of Publication 12-13 January 2019
Date of Posting 15-16 January 2019

**AAJKAL (Urdu)**
Vol.77 No.07
February 2019

Licensed U (DN) 50/2018 - 20 to post
without pre-payment at RMS Delhi
Rs. 22/- Annual Rs. 230
ISSN 0971-846X

"देश के लोगों से ही लोकतंत्र बनता है। हमारे नागरिक, केवल गणतंत्र के निर्माता और संरक्षक ही नहीं हैं, बल्कि वे ही इसके आधार स्तम्भ हैं।" - **राम नाथ कोविन्द**

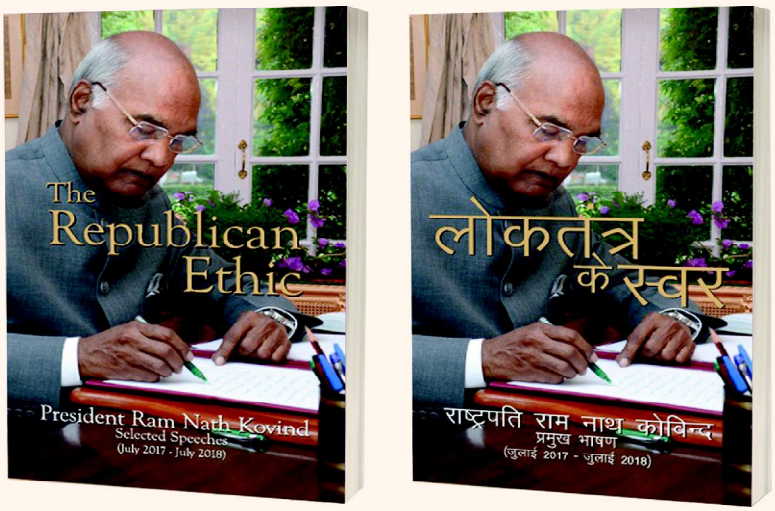


# लोकतंत्र के स्वर
एवं
# दि रिपब्लिकन एथिक

**(राष्ट्रपति राम नाथ कोविन्द के चुने हुए भाषण)**

ऑर्डर के लिए संपर्क करें-फोन : **011-24367260, 24365609**
ई मेल : **businesswng@gmail.com**

पुस्तकें www.bharatkosh.gov.in पर ऑनलाइन उपलब्ध हैं।

**ई-बुक एमाज़ोन और गूगल प्ले पर उपलब्ध।**

**प्रकाशन विभाग**
सूचना एवं प्रसारण मंत्रालय, भारत सरकार
सूचना भवन, सी जी ओ कॉम्पलेक्स, लोधी रोड
नई दिल्ली -110003
वेबसाइट : www.publicationsdivision.nic.in

@ DPD_India

Printed and Published by **Dr. Sadhana Rout,** DG, Publications Division, Soochna Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Printed at M/s I G Printers Pvt Ltd. 104,DSIDC Complex, Okhla Indl Area Phase I New Delhi. 110020 Senior Editor : **Hasan Zia**